حکمتِ قرآن

علامہ حمید الدین فراہی

امام حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ

خالد مسعود

دائرہ حمیدیہ

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

نام کتاب : حکمت قرآن

مصنف : امام حمید الدین فراہیؒ

مترجم : خالد مسعود

قیمت : ۱۱۰ روپے

ناشر : دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

Name of Book : **HIKMAT-E-QUR'AN**

Author : **Imam Hamiduddin Farahi**

Translated by : **Khalid Masood**

Distributed by : **Al-Balagh Publications**

Flat No.10, N-1, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone. 011-26942592
E-mail abpublications@gmail.com

Price Rs. 110.00

فہرس

حصہ اول

حصہ دوم

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حکمتِ قرآن امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی دو غیر مطبوعہ عربی کتابوں حکمۃ القرآن اور النظام فی الدیانۃ الاسلامیۃ کا اردو ترجمہ ہے۔ ثانی الذکر کتاب اول الذکر کتاب ہی کا ایک جزو ہے اور اور دین کے مہمات امور کی حکمت اس کا موضوع ہے۔ اس لیے دونوں کتابیں ایک ہی عنوان حکمتِ قرآن کے تحت جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ ترجمہ اس مسودہ سے کیا گیا ہے جو امام فراہیؒ کے شاگردِ خاص مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی کی تحویل میں رہا ہے۔

مصنف کا تعارف

امام حمید الدین فراہیؒ ۱۲۸۰ھ میں یو پی (بھارت) کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ مولانا شبلی نعمانیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ آپ کا خاندان تعلیم اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے ضلع کا ایک معزز خاندان تھا۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آپ نے عربی زبان ابتداء میں مولانا شبلیؒ سے اور بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر مولانا فیض الحسن سہارن پوریؒ سے پڑھی۔ دینی تعلیم کے لیے آپ نے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ عربی فارسی اور دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد آپ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ سے جدید فلسفہ کی تحصیل کی، جس میں آپ کے استاد مشہور انگریزی مستشرق پروفیسر آرنلڈ تھے۔ مولانا نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے

گریجویشن کی۔

تعلیم سے فارغ ہوکر امام فراہیؒ کئی سال تک مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں آگئے اور وہاں چند سال تک عربی پڑھائی۔ اس دوران میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر یوسف ہارویز سے عبرانی زبان سیکھی۔ اس کے بعد آپ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے الٰہ آباد یونیورسٹی میں چلے گئے۔ وہیں سے آپ کی خدمات دار العلوم حیدر آباد دکن کے پرنسپل کے عہدہ کے لیے نظامِ دکن نے لے لیں۔ یہ دار العلوم اس زمانہ میں حیدر آباد کا سب سے بڑا سرکاری مدرسہ تھا، جو ریاست کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے آدمی تیار کرتا تھا۔ حیدر آباد کے زمانہ قیام میں مولانا کے سامنے ایک ایسی یونیورسٹی کا تخیل آیا جس میں تمام دینی وعصری علوم کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ مولانا کا یہ تخیل بالآخر جامعہ عثمانیہ کی شکل میں عملی صورت میں سامنے آیا۔ لیکن حیدر آباد کے حالات سے مولانا خوش نہ تھے۔ لہٰذا وہاں کی زمہ داریوں سے استعفا دے کر اپنے وطن واپس آگئے۔ زندگی کے باقی ایام میں مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اور دار المصنّفین، اعظم گڑھ کے انتظامی اور علمی وتعلیمی معاملات میں دلچسپی لیتے رہے۔

مولانا کو پیشاب رک جانے کی تکلیف ہوگئی۔ اس کے لیے ان کو آپریشن کرانا پڑا، جو ناکام ہوا۔ (۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء) میں متھرا کے ایک ہسپتال میں آپ کا انتقال ہوا۔

امام فراہی علیہ الرحمہ عربی و فارسی کے ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی اور متکلم بھی تھے۔ لیکن اصلی چیز جو ان کے دل و دماغ پر حاوی تھی وہ قرآن تھا، جس کو سمجھنے کے لیے انہوں نے اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے کا حق ادا کر دیا۔ ان کا زمانہ وہ تھا جب سر سید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوب ہوکر قرآن مجید کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے افکار ونظریات سے

شدید طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے امام فراہیؒ نے قرآن پر براہِ راست غور و فکر کی طرح ڈالی، اس کے اصول متعین کیے اور قرآن فہمی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا، جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں اور مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کرسکیں۔ مولانا نے اس طریقہ کی وضاحت کے لیے ایک نا تمام تفسیر، نظام القرآن لکھی اور قرآنی فکر کو واضح کرنے کے لیے متعدد رسالے تصنیف کیے، جن میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں اور بعض ابھی تک مسودات کی شکل میں ہیں۔ یہ تمام رسالے عربی زبان میں ہیں۔

حکمتِ قرآن

حکمتِ قرآن امام فراہیؒ کے جن دو مسودات سے مرتب کی گئی ہے ان کے نام حکمة القرآن اور النظام فی الدیانة الاسلامیة ہیں۔ حکمة القرآن میں انہوں نے بتایا ہے کہ تعلیم حکمت رسول اللہ ﷺ کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔ حکمت خدا کی ایک عظیم نعمت اور اس کی رحمت کی تکمیل ہے، جو شکر کے نتیجہ کے طور پر بندہ کو حاصل ہوتی ہے۔ امام فراہیؒ نے ان شرائط کی نشان دہی کی ہے، جن کے پورا ہونے سے حکمت نشو و نما پاتی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ حکمت کا اصل خزانہ قرآن مجید ہے اور اس کی کلید قرآن کا نظم ہے۔ اس مسودہ کے مضامین کتاب کے حصہ اول میں شامل ہیں۔

کتاب النظام فی الدیانة الاسلامیة، دینِ اسلام کے بعض اصولی نظریات کی وضاحت کرتی ہے۔ اس میں نظامِ کائنات اور رب کی معرفت و عبادت کے موضوع زیر بحث آئے ہیں اور علم کلام کے بعض مشکل عنوانوں، مثلاً مقصدِ حیات، ہدایت و ضلالت، فلسفۂ ابتلاء، انسان کے اختیار اور شکر بطور اساسِ دین پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ تمام مضامین اس کتاب کے حصہ دوم میں شامل ہیں۔

اس کتاب کے ابواب اور ترتیب مصنف علیہ الرحمۃ کی قائم کردہ نہیں ہے، چوں کہ عربی مسودہ غیر مرتب حالت میں ہے اس لیے بعض منتشر فصلوں کو میں نے ترتیب میں اپنے ذوق سے جگہ دی ہے۔ مصنف علیہ الرحمہ اگر خود کتاب کو مرتب کرنے کی مہلت پاتے تو وہ اس سے مختلف ہوتی۔

کتاب کے مقدمہ کی حیثیت سے میرا ایک مقالہ شامل ہے جو میں نے امام فراہی سیمینار میں پیش کرنے کے لیے امام فراہیؒ کا تصور حکمت کے زیر عنوان لکھا تھا۔ لیکن بوجوہ اس میں شرکت کا موقع نہ مل سکا

امید ہے یہ کتاب قرآن مجید کی اصطلاح ـــ حکمت ـــ کو سمجھنے اور قرآن حکیم کی حکمت سے واقفیت حاصل کرنے میں ممد ثابت ہوگی۔ وباللہ التوفیق

لاہور

۱۸/ مئی ۱۹۹۵ء　　　　　　　　　　　　خالد مسعود

امام فراہیؒ کا تصورِ حکمت

'حکمت' کا لفظ دانائی کی باتوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور نہایت کثیرالاستعمال ہے لیکن مختلف علوم کے ماہرین اور اہل لغت اس کی تعبیر اتنے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک عام لفظ کے اندر کتنا جہانِ معانی آباد ہے۔ اہل فلسفہ اور صوفیہ اپنی کاوشوں کو حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اہلِ لغت اس کا مفہوم کچھ اور بیان کرتے ہیں، اہل تاویل کے مابین قرآن کے اندر لفظ حکمت کے معانی کے تعین میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں یوں تو لفظ حکمت متعدد مقامات پر آیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی کے بیان میں تعلیم حکمت کی تکرار اس قدر نمایاں ہے کہ آدمی اس کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے حکمت کے مفہوم کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

امام حمید الدین فراہیؒ کا موضوعِ فکر قرآن حکیم تھا، اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر تھی اور کسی بھی اہم لفظ یا مضمون پر سے وہ بلا تحقیق گزر جانے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے لفظ حکمت کی اہمیت کے پیش نظر اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس کی لغوی تحقیق ان کی کتاب 'مفردات القرآن' میں ہے جب کہ قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال پر انہوں نے اپنی ایک مستقل تصنیف 'حکمت القرآن' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ امام فراہیؒ کے نتائجِ تحقیق نہایت وقیع، فکر آفریں اور قرآنی مباحث کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

لفظ 'حکمت' کے معنی

لفظ 'حکمت' مادہ 'ح ک م' سے مشتق ہے۔ اسی مادہ سے دوسرا اسم 'حکم' ہے۔ لسان العرب میں حکم کے معنی 'العلم و الفقه و القضاء بالعدل' یعنی علم، سوجھ بوجھ اور عدل کے مطابق فیصلہ کے آئے ہیں۔ تاج العروس میں اس کے معنی ہیں: 'القضاء فی الشیء' یعنی کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا۔ اس میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق صرف اس فیصلہ پر ہوتا ہے جو عدل کے ساتھ طے کیا جائے۔ امام فراہیؒ کے نزدیک الفاظ کے لغوی معانی کے تعین کے لیے مرجع کی بہترین کتاب خود قرآن مجید ہے۔ اس کے استعمالات کی روشنی میں انہوں نے لفظ حکم کا اطلاق محض فیصلہ کرنے پر کیا ہے، خواہ یہ فیصلہ حق ہو یا باطل۔ اس معنی کے لیے ان کی رہ نمائی جن آیات سے ہوئی وہ یہ ہے:

ما لكم كيف تحكمون (القلم:٣٦)

''تمہیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟''

افحكم الجاهلية يبغون (المائدة:٥٠)

''کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں۔''

اول الذکر آیت مشرکین کی اس غلط رائے پر تعجب کا اظہار کرتی ہے جو وہ آخرت کے بارے میں ظاہر کرتے تھے۔ مؤخر الذکر آیت میں جاہلیت پر مبنی فیصلہ پر لفظ حکمت کا اطلاق کیا ہے۔ یہ فیصلہ، ظاہر ہے، حق کے مطابق نہ تھا۔ امام فراہیؒ کے نزدیک لفظ کا اصل مفہوم یہی تھا لیکن پھر اس کا اطلاق اس قوت پر بھی ہونے لگا جس کی بدولت آدمی صحیح فیصلے کرتا ہے۔

لفظ حکمت بھی مادہ 'ح ک م' سے اسم ہے، جس کے معانی لسان العرب میں 'معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم' یعنی اعلیٰ چیزوں کی بہترین

علوم کے ذریعہ سے حاصل کرنا۔ دوسرے معنی عدل کے بتائے گئے ہیں۔ تاج العروس میں اس سے مراد 'العلم بحقائق الاشیاء علی ما ھی علیه و العمل بمقتضاھا' یعنی اشیاء کی حقیقت کو ان کی اصلیت کے مطابق جاننا اور اس علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حق کو علم و عمل دونوں کے لحاظ سے درست قرار دینا اور عدل سے فیصلہ کرنا بھی حکمت قرار دیا گیا ہے۔ جرجانی کے نزدیک ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو حکمت کہلاتی ہے اور اس لفظ کا اطلاق اس علم پر بھی ہوتا ہے، جس کے ساتھ عمل پایا جائے۔ راغب اصفہانیؒ علم اور عقل سے حق کی مطابقت کو حکمت قرار دیتے ہیں۔ امام رازیؒ نے اس کی تعبیر قول و عمل کی درستی اور ہر شے کو اس کا مقام دینے سے کی ہے۔ امام فراہیؒ نے لفظ کے معانی کا تعین اولاً اہل عرب کے استعمالات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اہل عرب حکمت کا اطلاق اس قوت پر کرتے تھے جو عقل و رائے کی درستی اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی شرافت کی جامع ہو۔ اسی لیے وہ ایک دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ لہٰذا امام فراہیؒ نے حکمت کی تعبیر اس قوت سے کی ہے جس کے باعث آدمی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کے اثرات کلام کی حقانیت، اخلاق کی پاکیزگی اور حسنِ ادب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ثانیاً امام فراہیؒ کے پیش نظر قرآن مجید کی وہ آیات بھی ہیں جن میں حکمت کے معانی کا تعین کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا:

وَ اٰتَيۡنٰهُ الۡحِكۡمَةَ وَ فَصۡلَ الۡخِطَابِ (ص:۲۰)

''اور ہم نے اس کو حکمت اور معاملات کے فیصلہ کی صلاحیت عطا کی۔''

امام فراہیؒ کے نزیک الفاظ 'فصل الخطاب' میں حکمت کا ایک اثر یہ بیان ہوا ہے کہ جہاں حکمت موجود ہوتی ہے وہاں حق پر مبنی دوٹوک بات کہی جاتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں بعض اخلاقی ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ ؕ (بنی اسرائیل:۳۹)

”یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ کردار بھی حکمت ہی کا ایک پرتو ہے۔ ان آیات کی روشنی میں امام فراہیؒ کی بتائی ہوئی حکمت کی تعریف کی تائید ہوتی ہے۔

حکمت کی خصوصیات

مولانا نے حکمت کی بعض خصوصیات بیان کر کے اس کے تصور کو قریب الفہم بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمت کی بات عقل و دل کے نزدیک نہایت بدیہی اور واضح ہوتی ہے۔ یہ اس قدر دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکمت ایک نور ہے، جس طرح روشنی سے ارد گرد کی تمام چیزیں جگمگا اٹھتی ہیں اسی طرح حکمت کے نور سے آدمی کا علم منور ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کا اثر حرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور ہر شخص اس کو محسوس کر لیتا ہے، اسی طرح حکمت بھی اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک حکیم آدمی کا دل اپنے اندر رفعت محسوس کرتا ہے، اس کا کلام نہایت دل نشین ہوتا ہے، اس کا عمل نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہوتا ہے۔

لوگوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اہل فلسفہ حکمت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کو حکیم کہا بھی جاتا ہے لیکن امام فراہیؒ اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فلسفیوں نے علم اور عالم کو موضوع فکر تو ضرور بنایا لیکن بالعموم ان کے فکر کی کوئی مضبوط اساس نہ تھی۔ وہ اوہام کا شکار رہے اور علم کے اصل سرچشموں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ ارسطو تمام علوم کا احاطہ کر لینے کو حکمت کا نام دیتا تھا حالاں کہ علوم کا احاطہ

کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اس مخمصہ سے نکلنے کے لیے اس نے علم کو کلیات کے علم تک محدود کرنے کی کوشش کی اور مابعد الطبیعیات کے علم کو اعلیٰ حکمت قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ ابتدائی وہم سے نہ نکل سکا۔ امام فراہیؒ عام علوم کو حکمت کا موضوع سمجھتے ہی نہیں، اس لیے مسلمان فلسفیوں، اخوان الصفا، ابن سینا، الفارابی، الخوارزمی، الغزالی اور ابن خلدون کی علوم کی وہ تقسیم جس میں پائدار علوم کو حکمت کا نام دیتے ہیں صحیح نہیں ہے۔

امام فراہیؒ کے نزدیک ایک حکیم کے اندر حق کی جستجو کا مادہ اور جانچ پرکھ کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ باطل میں سے حق کو چھانٹ لیتا ہے۔ حق میں جو نورانیت ہوتی ہے اس کو حکیم کی فطرت کی بصیرت فوراً محسوس کر لیتی ہے۔ چوں کہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر بندے کا ایمان ہے۔ وہ اس حق کو پہچانے، اس پر اس کا دل مطمئن ہو جائے، وہ ہر باطل سے دست کش ہو جائے اور عمل صالح کو اختیار کر لے تو وہ بلاشبہ ایک حکیم ہے۔ اگر وہ ایمان تک نہ پہنچ سکا تو دوسرے علوم وفنون میں اس کی مہارت کی بدولت اس کو حکیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سلف میں حکمت کے مفہوم پر اختلاف کی وجہ

سلف صالحین کے دور میں حکمت کے قرآنی مفہوم کے تعین میں اختلاف واقع ہوا ہے، جس کی تفصیل تفسیر کی کتاب میں ملتی ہے۔ امام فراہیؒ کے پیش نظر یہ اختلاف تھا اور انھوں نے اس کو رفع کرنے کی نہایت عمدہ کوشش کی ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ امام مالکؒ اور ابورزین کی رائے میں حکمت سے مراد دین کی سوجھ بوجھ اور ایسا فہم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہوتا ہے۔ مجاہد نے اس کو قرآن کے فہم کے لیے مخصوص کیا ہے۔ یحییٰ بن معاذ کی رائے میں حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس کو وہ عارفین کے دلوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ ان پر دنیا کے مضر اثرات کا ازالہ کرے۔ ابن زید کے نزدیک ہر وہ بات حکمت کی بات ہے جو آدمی کو تنبیہ کرے، اس کو

کسی نیکی کی طرف بلائے یا کسی برے کام سے روکے۔ ابوجعفر محمد بن یعقوب ہر اس بات کو حکمت قرار دیتے ہیں جس سے صحیح فعل پیدا ہو۔ مقاتل کی رائے میں علم اور اس کے مطابق عمل کا نام حکمت ہے۔ امام فراہیؒ نے ان تمام اقوال کا حوالہ دے کر ان کو ایک ہی حقیقت کی مختلف انداز سے ترجمانی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک حکمت سب سے پہلے انسان کے دل میں بطور بصیرت و توفیق ظاہر ہوتی ہے۔ دل منور ہوتا ہے تو اس کا اثر کلام پر پڑتا ہے، چناں چہ حکمت کا اظہار انسان کے کلام سے ہونے لگتا ہے۔ وہ حق بات کہتا، نیکی کی تعلیم دیتا اور بدی سے روکتا ہے۔ اس کے بعد حکمت انسان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اخلاق فاضلہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح اس کے علم اور عمل میں کامل مطابقت ہو جاتی ہے۔ امام فراہیؒ کی اس تقریر کی روشنی میں مالک، ابورزین، مجاہد اور یحییٰ بن یعقوب نے کلام میں اس کے اثر کو نمایاں کیا ہے اور مقاتل نے علم و عمل دونوں میں حکمت کے اثرات کا حوالہ دیا ہے۔

رسول اللہ کے فرائض میں تعلیمِ حکمت

قرآن مجید میں نبی ﷺ کے فرائض منصبی کے ضمن میں تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تفسیر میں تعلیم کتاب کے لیے بالعموم مفسرین کا ذہن قرآن مجید کی طرف گیا ہے، لیکن تعلیم حکمت کے لیے وہ کسی بات پر اتفاق نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ، جن میں امام شافعیؒ سرفہرست ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہاں حکمت سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب کتاب اور حکمت کے الفاظ ساتھ ساتھ آ رہے ہیں تو لازم ہے کہ ان سے دو مختلف چیزیں مراد لی جائیں۔ چوں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور آپ کے احکام کا اتباع فرض ہے، اس لیے آں حضرت ﷺ کی سنت ہی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذکر کتاب اللہ کے ساتھ کیا جائے۔ لہٰذا حکمت سے مراد سنتِ رسول ہے۔ امام فراہیؒ نے اس نقطہ نظر سے اختلاف

کیا ہے اور اس کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی دو آیات ایسی پیش کی ہیں، جن میں کتاب اور حکمت کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں لیکن وہاں حکمت سے مراد سنت کو ہرگز نہیں لیا جاسکتا۔ وہ آیات یوں ہیں:

وَ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ (النساء:۱۱۳)

''اور اللہ نے تم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔''

وَ اذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالۡحِكۡمَةِ ؕ (الاحزاب:۳۴)

''اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے، اس کا چرچا کرو۔''

ان آیات میں حکمت کے لیے فعل 'انزل' اور 'یتلی' استعمال ہوئے ہیں جو قرآن میں صرف وحی آسمانی کے لیے آئے ہیں۔ آں حضرت ﷺ پر وحی نازل ہوتی اور اسی کی تلاوت آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ دونوں فعل کہیں بھی نبی ﷺ کے ارشادات و افعال کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔ مولانا فراہیؒ کا مزید استدلال یہ ہے کہ حدیثِ رسول، دانش و موعظت کے مضامین کے لیے خاص نہیں بلکہ احکامِ شریعت کی حامل بھی ہوسکتی ہے۔ اگر اس کا تعلق قانون سے ہو تو اس صورت میں اس پر حکمت کے لفظ کا اطلاق بالکل نامناسب ہوگا۔ مزید برآں قرآن مجید نے اپنی تعلیم کے اندر پائے جانے والے اصول دین کو سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۹ میں خود حکمت سے موسوم کیا ہے، لہٰذا یہ ہرگز ضروری نہیں کہ حکمت سے مراد قرآن سے باہر کی کوئی چیز سمجھی جائے۔ مولاناؒ کے نزدیک 'کتاب' سے قرآن مجید کے ایک ضابطہ شریعت ہونے کا

مفہوم نکلتا ہے اور حکمت یہ اس اعتبار سے ہے کہ اس میں شریعت کی حکمت، صحیح عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مضمون کی دلیل سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ فرمایا:

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

(آل عمران:۴۸)

''اور اللہ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا۔''

اس آیت میں کتاب اور حکمت کی تفسیر تورات اور انجیل سے کی گئی ہے۔ تورات ایک ضابطۂ شریعت تھی جس کی تعلیم ایک ایسی قوم کے لیے مناسب تھی جو ابھی عالم طفولیت میں تھی۔ اس کی ذہنی وقلبی استعداد اس سے زیادہ کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کو انجیل عطا کی گئی جس کے متعلق خود انہوں نے یہ وضاحت کردی کہ یہ صحیفۂ حکمت ہے:

وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ

(الزخرف:۶۳)

''اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم حکمت کے لیے تمثیلات کے اسلوب کا سہارا لیا۔ تاہم انجیل کی تعلیم بھی ادھوری تھی کیوں کہ بنی اسرائیل کی ذہنی استعداد ابھی تک کامل حکمت کے تحمل کے لائق نہ ہوئی تھی۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہ واضح پیغام دیا کہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن تم ان سب کا تحمل نہ کرسکو گے۔ لہٰذا اب میں جاتا ہوں اور میرے بعد جو آئے گا وہ تمہیں ان باتوں کی تعلیم بھی دے گا، جن کی تعلیم میں تمہیں نہ دے سکا۔ یہ بعد میں آنے والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

دونوں کا جامع ہے۔ اس میں ایک طرف حرام وحلال کی تمام حدود نہایت واضح اور متعین ہیں تو دوسری طرف یہ ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک کتاب وحکمت کے الفاظ استعمال کرنے سے قرآن مجید کی اسی حیثیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔

اس استدلال کی روشنی میں امام فراہیؒ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی رائے خطا پر مبنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حدیثِ رسول نہ صرف حکمت کی حامل ہوتی ہے بلکہ قرآن کی حکمت کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ مولانا فراہیؒ جہاں اسلاف میں کسی کو تنقید کا نشانہ بنائیں تو ان کا رجحان طبع یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے حسنِ ظن کو مجروح نہ ہونے دیں۔ چناں چہ امام شافعیؒ کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں لوگ قرآن کی تاویل غلط عقلیات کی روشنی میں کرنے لگ گئے تھے، جس سے آیات کا مفہوم کہاں سے کہاں جانکلتا تھا۔ امام صاحب نے ایسے لوگوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ فہم کتاب، سنت رسول کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے کیوں کہ سنت ہی کتاب اللہ کی تبیین کرتی ہے، ورنہ امام شافعیؒ نے اسی کتاب "الرسالۃ" میں جہاں یہ بحث لکھی ہے، مقدمۂ کتاب میں علم کو قرآن مجید کے علم پر منحصر مانا اور بتایا ہے کہ دل اگر منور ہوتا ہے تو حکمت کے نور سے منور ہوتا ہے اور یہ حکمت کتاب اللہ کے علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

تحصیلِ حکمت کی تدابیر

مولانا فراہیؒ کے نزدیک انسان کی دو بنیادی صفات اس کی قوتِ فکر اور قوتِ ارادہ ہیں۔ قوت فکر کے ذریعے وہ ان نشانیوں سے استدلال کرسکتا ہے، جن سے آفاق وانفس بھرے پڑے ہیں اور قوتِ ارادہ کی بدولت وہ خیر وسعادت کے کاموں کو اختیار کرتا ہے۔ حکمت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غور وفکر کے ذریعے حاصل ہونے والے

علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کر لے۔ حکمت کا منبع انسان کے خارج میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اس کی فطرت میں ہوتا ہے۔ اس لیے حکمت کے طالب کو اپنے نفس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکمت کا تحمل یک بارگی نہیں ہوتا بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے، جس طرح ایک نقشہ کے مطابق کسی عمارت کی تعمیر درجہ بدرجہ مکمل ہوتی ہے۔

مولانا فراہیؒ دل کے خشوع کو وہ دروازہ قرار دیتے ہیں جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہوکر اس کو زندگی بخشتی ہے۔ خشوع رکھنے والے شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کو پیدا کرنے والا عادل اور پاکیزہ رب ہے جب کہ انسان غلطی کا ارتکاب کرنے والا بھٹک جانے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ اس احساس سے آدمی میں خشیت پیدا ہوتی ہے، وہ خلوت و جلوت میں حدودِ الٰہی کی پابندی اختیار کرتا اور خواہشات نفس کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ ان صفات سے اس کا قلب صاف اور حکمت کے نور سے مستنیر ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

حصولِ حکمت کے لیے جو چیزیں نہایت اہم ہیں وہ ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن، اللہ کے بندوں پر شفقت اور ان کے لیے جذبۂ ترحم ہیں۔ قرآن حکیم حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے، لیکن اس کے اندر حکمت کے موتی تلاش کرنے کے لیے غور و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حصولِ حکمت کی تگ و دو کے لیے انسان جو ذرائع بھی اختیار کرے لیکن مولانا فراہیؒ کے نزدیک اس کے حصول میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کی وہ عطائے خاص ہے جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

کتاب حکمت القرآن

مولانا فراہیؒ کی کتاب 'حکمۃ القرآن' ابھی تک طبع نہیں ہوسکی۔ اس کا غیر مرتب مسودہ موجود ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس میں ...

شاید چار حصوں میں لکھنا چاہتے تھے مگر کام صرف تین حصوں پر ہو سکا۔ مسودہ کے پہلے حصہ میں حکمت کا مفہوم اور اس کی خصوصیات، حکمت اور ایمان کا تعلق، حکمت کی تعلیم اور اس کے حصول کا طریقہ پر چند فصلیں لکھی گئی ہیں۔ دوسرے حصہ میں مولاناؒ نے واضح کیا ہے کہ قرآن حکمت کا سب سے بڑا خزانہ اور اس کا اصل منبع ہے، لیکن حکمت اس کے نظم میں پوشیدہ ہے۔ نظم قرآن تک رسائی کے لیے وسیلہ بھی حکمت ہی ہے۔ حکمت کے بغیر آدمی یا تو نظم قرآن کا انکار کر دیتا ہے یا اس سے بعد محسوس کرتا ہے۔ کتاب کے اسی حصہ میں مولاناؒ نے واضح کیا ہے کہ ایک حکیم آدمی کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ تیسرے حصہ میں امام فراہیؒ دین اسلام کا مبنی بر حکمت نظام بیان کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے اس کا الگ نام تجویز کیا۔ 'النظام فی الدیانة الاسلامیة' اس میں دین کا اندرونی نظام، مختلف اجزاء کی باہمی موافقت اور خارج کے ساتھ اس کا تعلق بتایا گیا ہے۔ ان تینوں حصوں میں انہوں نے اپنے طریقہ کے مطابق بعض فصلیں تو سپردِ قلم کر دیں لیکن بعض ناتمام چھوڑی ہیں۔

حصہ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ا:

حکمت کا مفہوم

سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم والصلوٰة والسلام على سيدنا محمد عبده و رسوله الكريم و على آلهٖ و صحبه الموفين بعهده و كل من اتبعه على الصراط المستقيم۔

اما بعد! اس سے قبل کہ ہم یہ بتائیں کہ قرآن حکیم کی حکمت کیا ہے، جس سے اس نے ہمیں روشناس کرایا ہے، ہم حکمت کی تعریف میں سلف کے اقوال کسی قدر وضاحت کرتے ہوئے بیان کریں گے کہ ان سے ان کی کیا مراد ہے۔ مالکؒ اور ابورزینؒ کے نزدیک حکمت سے مراد دین کی سمجھ بوجھ اور وہ فہم ہے جو ایک مستقل صفت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہوتا ہے۔ مجاہدؒ نے حکمت سے مراد قرآن مجید کے فہم کو لیا ہے۔ مقاتلؒ کی رائے میں علم اور اس کے مطابق عمل کا نام حکمت ہے، لہٰذا جب تک علم اور عمل کسی آدمی میں جمع نہ ہو جائیں وہ حکیم نہیں ہوسکتا۔ مقاتل کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ حکمت کا علم رکھنے کے بعد اس کے مطابق عمل ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا جب تک حکمت کے ایک عالم کا عمل اپنے علم کے مطابق نہ ہو تو وہ حکیم نہیں ہوتا۔ ابن زید کے نزدیک ہر وہ بات جو آدمی کو تنبیہ کرے اور کسی نیکی کی طرف بلائے یا کسی برے کام سے روکے وہ حکمت کی بات ہے۔ ابوجعفر محمد بن یعقوبؒ ہر اس صحیح بات کو حکمت قرار دیتے

ہیں جس سے صحیح فعل پیدا ہو۔ یحییٰ بن معاذ کی رائے میں حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، جس کو وہ عارفین کے دلوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ ان پر سے دنیا کی سرگرمی کے مضر اثرات کا ازالہ کرے۔(۱)

حکمت کے مقامات

اللہ کی توفیق سے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام اقوال اصل میں ایک ہی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔

عباراتنا شتی و حسنك واحد
و كل الى ذاك الجمال يشير

''تیرا حسن ایک ہی حقیقت ہے، پر اس کے لیے ہماری تعبیریں الگ الگ ہیں۔ اصل میں ہر تعبیر اسی جمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''

یہ جاننا چاہیے کہ حکمت کے کئی مقامات ہیں۔ پہلا مقام دل ہے، جس میں سے حکمت، بصیرت اور توفیق کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مالکؒ، ابو رزینؒ، مجاہدؒ اور یحییٰؒ بن معاذ نے حکمت سے یہی مراد لیا ہے۔ مجاہدؒ نے حکمت کے مفہوم میں قرآن مجید کے فہم کو اس لیے خاص کر دیا ہے کہ وہ حکمت کی بنیاد ہے۔ جس نے قرآن کو سمجھ لیا وہ حکمت کے خزانے سے واقف ہو گیا۔ ہو سکتا ہے مجاہد کے پیش نظر آیت يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرة:۱۲۹) کی یہ تاویل رہی ہو کہ کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد اس کا فہم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجاہد نے یہ مفہوم نبی ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں بیان کیا ہو کہ اوتیت القرآن و مثله معه بل اكثر (مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اس کے ساتھ اور بھی، اسی کے مانند بلکہ اس سے زیادہ)۔ حکمت سے فہم

(۱) مصنف علیہ الرحمہ نے یہ اقوال تفسیر البحر المحیط لأبی حیان الاندلسی سے نقل کیے ہیں۔ دیکھیے جلد اول ص ۳۹۳۔ دار الفکر بیروت ۱۹۸۳ء

قرآن کو مراد لینا اس مفہوم سے زیادہ قرین قیاس ہے جس مفہوم کی طرف امام شافعیؒ یا دوسرے اصحابِ حدیث گئے ہیں۔ ان کے نزدیک کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ اسی لیے انہوں نے حدیث کا مفہوم یہ سمجھا کہ سنت قرآن کے مانند بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ وہ قرآن سے قریب تر سنت سے زیادہ کسی اور چیز کو نہ جانتے تھے۔ حکمت کا دوسرا مقام کلام میں ہے۔ اسی لیے حکمت کا کلمہ وہ ہے جو حق ہو، صحیح ہو یا نصیحت ہو۔ ابن زیدؒ اور ابوجعفر محمد بن یعقوبؒ کے قول کا مفہوم یہی ہے۔ حکمت کا تیسرا مقام علم و عمل میں بھی ہے اور یہ دونوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مقاتلؒ نے حکمت کو اسی مفہوم میں لیا ہے۔ قرآن مجید نے لفظ حکمت کا اطلاق ان تمام پہلوؤں پر کیا ہے۔ ہر جگہ قرینہ یہ بتایا ہے کہ ان میں سے کون سا پہلو اس جگہ مراد ہے: دل، کلام یا علم و عمل ہر مقام میں حکمت علمی یا عملی دونوں پہلوؤں سے مراد ہوتی ہے، بلکہ غور کرنے سے اس کے مزید پہلو بھی سامنے آتے ہیں، البتہ حکمت بمعنی بصیرت و توفیق اصل ہوتی ہے جب کہ باقی چیزیں اس کے آثار اور مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حکمت کی خصوصیات

علماء کے مذکورہ اقوال کے بعض پہلو اشارات کی نوعیت کے بھی ہیں جن پر متنبہ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اولاً یہ کہ حکمت خواہ نصیحت کے انداز کی ہو یا حق بات کے طور پر ہو، یہ ضروری ہے کہ وہ بالکل واضح ہو اور کسی دلیل کی محتاج نہ ہو۔

ثانیاً قلب کو جب حکمت حاصل ہوجاتی ہے تو اس کو رفعت عطا کرتی ہے۔ ایک حکیم نفس کی بندگی سے بالاتر ہوکر دنیا کے مضر اثرات سے اپنے دل کو پاک کرلیتا ہے۔ لہٰذا وہ خدا کو پہچاننے والا، مصیبت پر صبر کرنے والا، نعمت پر شکر ادا کرنے والا، بردبار، درگزر کرنے والا، سخی، شریف، دردمند اور خدا کی جانب جھکنے والا بن جاتا ہے۔ یہ وہ

شخص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ طبیعت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کے نور کی طرف لے جاتا ہے۔

ثالثاً حکمت ان علوم کے مجموعہ کا نام نہیں جو سیکھے جاتے ہیں، بلکہ یہ ایک نور ہے۔ جو شے اس کے قریب آئے اس کو یہ روشن کر دیتی ہے۔ اس میں خیر وشر یا خوبی و خرابی کے تمام پہلو واضح کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک حالت اور صفت ہے۔ چوں کہ علم کا سروکار بھی انھی امور سے ہوتا ہے اس لیے کبھی علم کا لفظ بھی اس معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔

رابعاً حکمت درحقیقت روح اور قوت ہے۔ یہ ان علوم کی مانند نہیں جو عمل سے عاری ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ علم وعمل کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی مثال سورج اور اس کی روشنی یا آگ اور اس کی حرارت سے سمجھی جا سکتی ہے۔

خامساً حکمت کا تعلق اُن امور سے ہے جو نیک بختی اور نفس کی پاکیزگی کا وسیلہ ہیں۔ وہ علوم جن کا حاصل دنیوی زندگی کے فائدے ہیں مثلاً دست کاریاں، فنون یا محض ایسی واقفیت جس کے ساتھ تزکیۂ نفس اور نیک اعمال کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، حکمت اور ایمان کے دائرے سے خارج ہیں۔

سادساً بنیادی نیکیوں، مثلاً سخاوت، عدل، پاک دامنی وغیرہ میں چوں کہ حکمت کا عمل دخل زیادہ ہے اس لیے ایک حکیم ان کو ایک واضح اصول کے طور پر جانتا ہے، اس لیے جب اس سے کوئی سوال کیا جائے یا اسے ان پر گفتگو کی ضرورت محسوس ہو تو وہ احکام کی جزئیات میں انھی اصولوں کی بنیاد پر اور حکمت کی مدد سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بنیادی نیکیاں بھی حکمت کہلاتی ہیں۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں انجیل کو حکمت کہا گیا ہے اور اسی طرح کی بنیادی نیکیاں قرآن مجید میں جہاں بیان ہوئی ہیں، اس کے آخر میں یہ آیت آئی ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط (بنی اسرائیل:۳۹)

''یہ احکام اس حکمت کا حصہ ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہے۔''

اسی طرح حضرت لقمان کے نصائح بیان کرنے سے پہلے فرمایا:

وَ لَقَدْ آتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمان:۱۲)

''بے شک ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی۔''

سابعاً دل کے اندر حکمت کوئی بہت ہی لمبی چوڑی، باریک اور گہری چیز نہیں بلکہ نہایت ہلکی سی چیز ہوتی ہے اس لیے حکیم کو اس شخص کی حالت پر تعجب ہوتا ہے جس کو یہ حاصل نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ایک آدمی نماز پڑھتا ہے۔ اس کی زبان پر ذکر کے کلمات جاری ہوتے ہیں، لیکن اپنے دل میں نہ وہ خشوع پاتا ہے نہ خدا کی یاد، تو ایک حکیم آدمی کو اس پر تعجب ہوتا ہے۔ یہ بات اسے نہاہت سنگین نظر آتی ہے کہ ایک بندہ تو ہو اپنے آقا کے سامنے، وہ زبان سے اس سے باتیں بھی کر رہا ہو اور سرگوشیاں بھی، وہ اس کی آیات کی تلاوت بھی کر رہا ہو لیکن اس کے باوجود اس کا خیال ہر وادی میں بھٹک رہا ہو۔ پھر وہ یہی حرکت ہر روز کرے اور اسی حالت میں ناتوانی اور بڑھاپے کو پہنچ جائے۔ اسی طرح ایک شخص ہو تو خطیب، واعظ اور نصیحت کرنے والا لیکن وہ زبان سے وہ باتیں نکالے جن کا اس کے اپنے دل میں کوئی اثر نہ ہو۔ حکمت کی بصیرت کوئی دور کی چیز نہیں جس کے حاصل کرنے کے لیے کسی بڑی گہرائی، سوچ بچار اور علم کی ضرورت ہو مگر اس کے ساتھ ہی یہ تمام لوگوں میں لٹائی نہیں جاتی۔ اس کے مستحق بس اللہ کے وہ منتخب بندے ہیں، جن کی خصوصیات اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ آیات میں بیان کی ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ (البقرۃ:۲۶۹)

”وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔“

لہٰذا اگر کوئی شخص چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ حکمت تمام واضح چیزوں سے واضح تر اور بدیہی ہے۔ دل پر پردہ پڑ جائے تو آدمی کو اندھا بنا دیتا ہے۔ اس صورت میں نور کا کوئی قصور نہ ہوگا بلکہ قصور نگاہ کا ہوگا۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے احوال کئی آیات میں مختلف اسالیب سے واضح فرمائے ہیں۔ مثلاً:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج:۴۶)

”کیوں کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔“

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں دیکھتے تو ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ یہ ان کے دل ہوتے ہیں جو اندھے ہو جاتے ہیں۔

حکمت کے دوسرے نام

جس طرح حکمت ایک بنیادی وصف ہے، جس کی کئی شاخیں اور کئی پہلو ہیں اور ان سب پر لفظ حکمت کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح حکمت کے کئی دوسرے نام بھی ہیں۔ جو شخص حکمت کے مفہوم کو سمجھتا ہو اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں یہ لفظ استعمال کر کے حکمت کو مراد لیا گیا ہے۔ ایسے ناموں میں سے بعض نام یہ ہیں: ایمان، علم، حق، سکینت، روح، ہدیٰ، بصیرت، نور، امانت، لب، حظ عظیم اور خیر کثیر۔

ایمان اصل حکمت ہے

جس طرح لفظ ’حکمت‘ نام ہے علم، حالت اور عمل کے مجموعے کا اسی طرح

ایمان بھی ان سب کے مجموعہ کا نام ہے۔ حکمت کی بنیاد اور جڑ ربوبیت پر ایمان ہے کیوں کہ ایمان ہی کے نتیجہ میں جب ایک بندۂ مومن خداوند تعالیٰ کی عبودیت کی طرف اپنے نفس کو مائل کرتا ہے تو اس سے اس کی ظلمت دور ہو جاتی ہے اور محبت الٰہی کا نور اس کو ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر بندہ اپنے رب کی رضا کے راستے کی جستجو کرتا ہے تو اسے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ تب وہ نیکی کے راستوں کو اختیار کرتا ہے، مخلوق کو وہ اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو دیکھتا ہے۔ اور یہ نگاہ شفقت و مہربانی کی نگاہ ہوتی ہے۔ اسلام کی حقیقت بھی یہی ہے۔ بندہ کو محبت الٰہی کے نتیجہ میں اطاعت اور فرماں برداری حاصل ہوتی ہے اور فساد اور قطع رحمی جیسی برائیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (البقرۃ:۲۵۷)

"اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔"

قرآن مجید نے کلمۂ توحید کی تمثیل بھی بیان فرمائی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ توحید کی جڑیں فطرتِ انسانی میں ہیں اور وہ تمام بھلائیوں اور نیکیوں کی طرف رہ نمائی دیتی ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ○ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا

كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ط (ابراہیم:۲۴-۲۵)

''کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔''

ربیعؒ بن انس کا قول ہے کہ آیت میں 'اصل ثابت' سے مراد اللہ واحد کے لیے اخلاص اور اس کے شریک ٹھہرائے بغیر اس کی خالص عبادت ہے۔ شاخوں سے مراد نیکیاں ہیں۔ چناں چہ بندۂ مومن کے اعمال دن کے آغاز اور انجام پر اوپر جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ شجرہ طیبہ اپنے رب کی توفیق سے ہر آن اپنا پھل دیتا ہے۔ چناں چہ چار اعمال جن کو اگر بندہ جمع کر لے تو پھر فتنے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ ہیں: اللہ واحد کے لیے اخلاص، اس کی ایسی عبادت جس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا گیا ہو، اس کی خشیت اور محبت اور اس کی یاد۔ اس قول میں فتنوں سے نقصان نہ پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ ایمان میں نہایت پختہ ہو جاتا ہے تو اس کے قدم کسی آزمائش یا دشمنوں کے غلبہ کے دوران ڈگمگاتے نہیں ہیں۔

جاننا چاہیے کہ تخلیق ایک حرکت کی مظہر ہے۔ ہر چیز کا عمل اس کی حرکت ہوتی ہے۔ ایک عمل دل کا ہے، ایک عقل کا اور ایک حواس کا۔ ایک حرکت سے دوسری حرکت پیدا ہوتی ہے چناں چہ دل میں جو حرکت پیدا ہوتی ہے وہ فکر میں بھی ایک حرکت پیدا کرتی ہے۔ فکر کی یہ حرکت اعضاء و جوارح کے مراکز کو متحرک کر دیتی ہے اور یہ مراکز بالآخر اعضاء و جوارح کو تحریک دیتے ہیں۔ جب یہ سب تحریکیں متفق ہو جاتی ہیں تو عمل کی قوتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ یہ موافقت اگر مستقل پائی جائے تو اصل (جڑ) اور فرع (ٹہنی) مضبوط ہوتی ہیں۔ دل کے اندر ایمان کے جڑ پکڑنے کی شکل ٹھیک یہی ہوتی ہے۔ ان کے ... کو عملی ... نشوونما ...

مضمون کی طرف اشارہ آیت اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ (فاطر:۱۰) ''اسی کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عملِ صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔'' میں ہے۔ اوپر والی آیت میں الفاظ 'وَ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ' ''اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔'' میں اشارہ قربِ الٰہی کی طرف ہے۔ بندہ اس فرع کی بدولت رب کی طرف بلند ہوتا ہے۔ جس بندے نے اپنا دین اللہ واحد کے لیے خاص کرلیا اور اس کی وحدانیت میں ہر قسم کا شک دل سے نکال دیا، لازم ہے کہ وہ پورے اخلاص سے اس کی بندگی کرے۔ بندگی میں خلوص اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ بندہ خدا کی خشیت نہ رکھتا ہو اور اس کا ڈرنا خدا کے ڈر کے تابع نہ ہو۔ پھر یہ بھی لازم ہے کہ بندے کی رغبت اور محبت خدا کے لیے ہو۔ ذکر خدا کی محبت اور خشیت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کیوں کہ بندہ اس چیز کو زیادہ یاد رکھتا ہے جس کو محبوب رکھتا ہے یا جس سے ڈرتا ہے۔ ذکر گویا دل میں چھپی ہوئی محبت یا خشیت سے آگاہ کرنے والی چیز ہے۔ چناں چہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

انه لیغان علی قلبی و انی لاستغفر الله (۱)

''میرے دل پر حجاب آجاتا ہے تو میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔''

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ حکمت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اور نبی ﷺ کو اس کا معلم بنایا گیا ہے، کیوں کہ آپ اس کے تقسیم کنندہ اور ذریعہ تھے، جیسا کہ فرمایا:

اِنَّكَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ

(القصص:۵۶)

''تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی الاستغفار

اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا کہ

انما انا قاسم و المعطی هو الله'

''میں تو محض تقسیم کنندہ ہوں، عطا کرنے والا تو صرف اللہ ہے۔''

قرآن مجید نے دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس:۱۰۰)

''اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لا سکے مگر اللہ کے اذن سے اور وہ گندگی لا دیا کرتا ہے ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''

امام شافعیؒ کے نزدیک حکمت کا مفہوم

تمام بڑے اہل حدیث علماء کا دعویٰ یہ ہے کہ حکمت سے مراد نبی ﷺ کی سنت ہے۔ اس کے لیے امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ کی تحریر سے دلیل لائی جاتی ہے جو یوں ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی اور اپنے رسول کی سنت کی اتباع لوگوں پر فرض کی ہے، چناں چہ اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ (البقرۃ:۱۹۲)

''اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوْا مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ٥

(آل عمران:۱۶۴)

"یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گم راہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

نیز فرمایا:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنكُمْ يَتْلُوْ عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:۱۵۱)

"چناں چہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے، جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

یہ بھی فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوْا مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (الجمعہ:۲)

"اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے، جو ان کو

اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

ایک جگہ فرمایا:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ (البقرۃ:۲۳۱)

"اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری۔"

دوسرے مقام پر یوں ہے:

وَأَنزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيماً (النساء:۱۱۳)

"اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔"

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيفاً خَبِيراً (الاحزاب:۳۴)

"اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو، بے شک اللہ باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔"

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو کتاب کا ذکر کیا ہے، جس سے مراد قرآن ہے اور دوسرے حکمت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کے بعض عالموں کو جو میرے نزدیک پسندیدہ ہیں میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ حکمت سے مراد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ اس قول سے ملتا جلتا ہوا قول یہ بھی ہے کہ ان آیات میں اصلاً قرآن کا ذکر کیا گیا اور حکمت اسی کے تابع ہے (واللہ اعلم)۔ ان میں اللہ

تعالیٰ نے خلق پر اپنا احسان جتایا ہے کہ اس نے ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ لہٰذا یہ جائز نہیں کہ یہاں حکمت سے رسول اللہ کی سنت کے سوا کچھ اور مراد لیا جائے (واللہ اعلم)۔ کیوں کہ حکمت کا لفظ کتاب اللہ کے ساتھ آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اطاعت فرض قرار دی اور لوگوں پر آپؐ کے احکام کی پیروی لازمی قرار دی ہے۔ پس کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے سوا کسی قول کے بارے میں یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ فرض ہے۔ یہ اس لیے کہ رسولؐ اللہ پر ایمان اور اللہ پر ایمان دونوں ایک ساتھ ضروری ہیں اور رسول اللہؐ کی سنت اللہ تعالیٰ کے مراد معانی کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ اس کے خاص اور عام مفہوم کی طرف رہ نمائی دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ حکمت کو لفظ کتاب کے ساتھ جوڑا ہے اور اس کے تابع بھی کیا ہے۔ تو یہ معاملہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کے لیے نہیں کیا۔'' (۱)

یہ ہے امام شافعیؒ کا کلام ان آیات کے بارے میں جن میں لفظ حکمت، کتاب یا آیات کے ساتھ جڑا ہوا آیا ہے۔ امام علیہ الرحمہ نے اس وضاحت میں اہل تاویل ہی کا ایک مذہب اختیار کیا ہے۔ چوں کہ عام کبھی کبھی بعض خاص افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور حکمت کا لفظ فہم کے معنی میں آتا ہے، اس لیے امام شافعیؒ سے پہلے کے علمائے تاویل مثلاً مجاہدؒ وغیرہ نے اس کو کتاب اللہ کے فہم کے لیے خاص کر دیا۔ امام رحمہ اللہ نے اپنے عہد میں جب یہ دیکھا کہ فہمِ کتاب اللہ کے بعض مدعی قرآن کی تاویل غلط عقلیات کی روشنی میں کرتے ہیں اور لوگ اسی کو حکمت گمان کر لیتے ہیں تو اس پر امام

---

(۱) الرسالة للشافعي: باب ما نزل عاما دلت السنة خاصة۔ بيان فرض الله في كتابه اتباع سنة نبيه۔ مصطفى البابي طبع ۱۹٤۰ء، ص ۷۷۰، ۷۷۹

صاحبؒ نے متنبہ کیا کہ کتاب اللہ کا فہم سنتِ رسول سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سنت رسول کے سوا کسی دوسرے شخص کے قول کی اتباع ہمارے اوپر فرض نہیں کی۔ اس نے ہم پر قرآن اور حکمت کی تعلیم کا احسان کیا۔ لہٰذا ہم خدا کے نبی کی سنت کے سوا اور کوئی چیز اس لائق نہیں پاتے کہ جس کو کتاب اللہ کے ساتھ ملا سکیں۔ امام رحمہ اللہ نے یہ تاویل جو اختیار کی تو اس میں اُن کے حسن نیت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے سوا کسی چیز کو دخل نہیں۔ اللہ ہماری طرف سے ان کو جزائے خیر دے۔

امام صاحب نے اس مقام کے علاوہ دوسرے تمام مواقع میں حکمت کے مشہور معنی ہی مراد لیے ہیں۔ مثلاً وہ اسی کتاب کے خطبہ میں یوں لکھتے ہیں:

> ''اللہ جل شانہ نے اپنی کتاب میں جو کچھ اتارا وہ سراسر رحمت اور حجت ہے۔ اس کا جاننا اصل علم اور اس سے ناواقفیت اصل جہالت ہے۔ جو اس کو نہیں جانتا اس کا علم کچھ نہیں اور جو اس کو جانتا ہے وہ جاہل نہیں ہوسکتا۔[1] علم کے معاملہ میں لوگوں کے کئی طبقات ہیں۔ علم میں ان کا درجہ اسی قدر ہے جتنا ان کو قرآن کا علم حاصل ہے۔ پس ایک طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے علم میں اضافہ کے لیے اپنا پورا زور لگا دے اور اس کے حصول میں جو بھی رکاوٹ پیش آئے اس کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرے۔ اس کے سمجھنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے میں اللہ کے لیے اپنی نیت کو خالص رکھے۔ اس میں وہ اللہ ہی سے طالب مدد ہو کیوں کہ کوئی خیر اللہ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ جس شخص نے نص اور دلیل کی رو سے اللہ کے احکام کا علم اس کی کتاب سے پالیا، پھر اس کو اسی کے مطابق کہنے اور کرنے کی

---

(۱) مراد یہ ہے کہ جو شخص کتاب اللہ سے ناواقف ہے اس کا علم میں کوئی حصہ نہیں اور جو شخص اس کا علم رکھتا ہے اس کو کسی دوسرے علم کی حاجت نہیں۔ آگے اس بات کی انہوں نے تصریح فرما دی ہے۔ (فراہی)

توفیق بھی حاصل ہوگئی تو وہ اپنے دین اور دنیا میں فضیلت کا درجہ پانے میں کامیاب ہوگیا۔(۱) شکوک وشبہات اس سے دور ہوگئے۔ اس کے دل کو حکمت نے منور کر دیا اور اس نے دین میں امامت کا مرتبہ واجب کر لیا۔ پس ہم اللہ تعالیٰ سے جس نے ہمارے اوپر نعمت کی ابتدا اس وقت کی جب ہم ابھی اس کے لیے استحقاق نہیں رکھتے تھے، وہ ہمیں اس سے برابر فیض یاب کر رہا ہے، جب کہ ہم اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں اور جس نے ہمیں بہترین امت بنایا جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی۔ سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی کتاب کا پھر اپنے نبی ﷺ کی سنت کا فہم عطا فرمائے اور ایسے قول وعمل کی توفیق دے جو ہم سے اس کا حق ادا کروادے اور ہمارے لیے مزید عطا واجب کر دے۔"(۲)

یہ کلام عظیم فوائد پر مشتمل ہے اور اپنی گہرائی کی بنا پر شرح کا محتاج ہے۔ امام صاحب نے اس میں حکمت کی ایک بہت بڑی بنیاد کی طرف رہ نمائی کی ہے، جس کے بعض نکات ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) دین اور دنیا میں آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کو کامل کر لیتا ہے۔ اس میں وہ شک کے در آنے کا موقع نہیں دیتا۔ اس سے اس کے دل میں ایمان کا نقطہ روشن ہو جاتا ہے تو اس کا علم و یقین اس کی نیت کی پاکیزگی اور عمل کے خلوص کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے فہم کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے جس طرح وہ ایمان کے نقطہ میں سے شک کو نکال باہر کرتا ہے، یہی رویہ وہ مسائل کی جزئیات میں سچی بات کا فیصلہ کرنے میں اختیار کرتا ہے۔ چناں چہ اس کے لیے حق باطل سے ممیّز ہو جاتا ہے۔ (فراہی)

(۲) الرسالۃ للشافعی، خطبۃ الکتاب: مصطفیٰ البابی طبع ۱۹۴۰ء، ص ۱۹

(۳) مصنف علیہ الرحمۃ نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ شاید وہ یہاں یہ وضاحت کرنا چاہتے تھے کہ امام شافعیؒ قرآن مجید کو تمام علم وحکمت کی بنیاد مانتے تھے۔ ان کے نزدیک اسی کا فہم حکمت کی کلید ہے اور ایک شخص اس کے فہم میں جس قدر ترقی کرے گا وہ اسی قدر حکمت سے بہرہ ور ہو سکے گا۔ نیز امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح علم اور صحیح عمل دونوں کا جمع ہونا حکمت پیدا کرتا ہے۔ (مترجم)

باب ۲:

حکمت کی اصل اور اس کی فروع

اللہ سبحانہ و تعالیٰ غنی (بے نیاز) ہونے کے ساتھ ساتھ حمید (قابل ستائش) بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی کو فقر اور احتیاج لاحق ہو اور پھر بھی وہ ستائش کے کمال کو پہنچا ہوا ہو۔ خداوند تعالیٰ نہ ہی کسی ذاتی نفع کے لیے کوئی فعل کرتا ہے اور نہ بغیر فعل کے رہتا ہے کیوں کہ بیکار تو اس سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے جو ذاتی منفعت کے لیے کام کرنے والا ہو۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ہر فعل صرف شفقت و رحمت کے باعث ہوتا ہے اس لیے وہ غنی بھی ہے اور حمید بھی۔ وہ اپنے استغناء اور کمال کے سبب سے بھی حمید ہے اور اپنی شفقت کے لحاظ سے بھی حمید ہے۔

شکرِ نعمت سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے

فعل تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے انعام کا پہلا اور کامل ترین اظہار ہوا۔ اس کے بعد اس نے خلق کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا جس سے خلق پر یہ واجب ہوگیا کہ وہ خدا کی حمد کرے اور اس کا شکر بجا لائے۔ بے حد و حساب نعمت و فضل سے نوازنے والی رحیم ہستی، جس نے پہلے نعمت عطا فرمائی، کیسے ممکن ہے کہ بندوں کے شکر ادا کرنے کے نتیجہ میں اپنی نعمتوں میں اضافہ کرے۔ اس لیے فرمایا:

لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم:۷)

”اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمہیں بڑھاؤں گا۔“

اللہ تعالیٰ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ وہ خود حق ہے اور حق ہی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ چناں چہ فرمایا:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (التین:۸)

''کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟''

اسی حقیقت کو ایک مقام میں اس نے اس طرح واضح فرمایا:

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ (القلم:۳۶)

''کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟''

اسی لیے آیت لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ کے فوراً بعد یہ بھی فرما دیا: وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراہیم:۷)

''اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اس حق و انصاف کے مطابق ہے جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرتا اور ایک چیز کو اسی جیسی دوسری چیز کے ساتھ جوڑتا ہے۔ لہٰذا جس طرح شکر فضل میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اسی طرح ناشکری پہلے سے موجود نعمت کو بھی چھین لیتی ہے۔ اگر نتیجہ کو عمل سے مطابق کرنے کا قاعدہ جاری نہ ہوتا تو نہ اللہ تعالیٰ کسی خوب کار کو محبوب رکھتا اور نہ کوئی نیک آدمی نیکی کو اختیار کرتا۔ پس شکر کرنے والے پر نعمت کی زیادتی ایک حق واجب ہے۔ بالکل اسی طرح اس کے برعکس عمل یعنی ناشکری پر سزا کا ملنا بھی واجب ہے۔

حکمت سب سے بڑی نعمت ہے

شکر کا جذبہ نعمت کی قدر پہچاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ قدر پہچاننے کا مطلب نعمت کو اس کا ٹھیک مقام دینا اور جس مقصد کے لیے وہ دی گئی ہے، اسی مقصد میں اس کو استعمال کرنا ہے۔ نعمت کو استعمال میں نہ لانا بھی اس کو ضائع کرنا ہے لیکن اس کو اس کے مقصد کے خلاف استعمال کرنا اس کا زیادہ بڑا ضیاع اور شدید قسم کی ناشکری ہے، جو شخص نعمت کی قدر پہچانتا ہے اور وجود، حیات، علم، خیر کی معرفت، متضاد عناصر میں امتیاز اور بھلائی کی طرف رغبت میں اس کی ترتیب سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ ان میں سب سے بڑی جلیل القدر نعمت حکمت کی نعمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُؤتِى الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيراً (البقرة:۲۶۹)

''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے، اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔''

حکمت کی نعمت شکر گزار بندوں کو ملتی ہے

یہ حکمت وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے ہر ایک کو نہیں دی، بلکہ وہ یہ نعمت اسی کو دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور یہ اسی کو ملتی ہے جو شکر ادا کر کے اور فطری ہدایت کی نعمتوں کو ٹھیک طرح استعمال کر کے اپنے آپ کو اس کا حق دار بنا لیتا ہے۔ فطری ہدایت اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو دی ہے، جیسا کہ فرمایا:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً (الدھر:۳)

''ہم نے اس کو راہ سمجھا دی۔ چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس راستے پر کھڑا کر دیا ہے جو اس کو کمال تک پہنچانے

والا ہے۔ لہٰذا انسانوں میں سے جو اس فطری ہدایت کو استعمال میں لائیں گے اور شکر ادا کریں گے، اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرمائے گا:

وَ الَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد:۱۷)

"اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی۔"

اس کے برعکس جو لوگ فطری ہدایت کی نعمت کا جوا اتار پھینکیں گے اور اس پر عمل کرنے میں غلطی کریں گے تو وہ سیدھی راہ گم کر دیں گے اور بھٹک کر ہلاک ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَ اَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ

(حم السجدۃ:۱۷)

"رہے ثمود تو ہم نے ان کو ہدایت کی راہ دکھائی لیکن انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی تو ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو بھی عذابِ ذلت کے کڑکے نے آدبوچا۔"

پس ثمود نے جس طرح کی چیز پسند کی اسی کے مانند کا بدلہ ان کو دیکھنا پڑا، انہوں نے اپنی بری کمائی کا برا نتیجہ دیکھا کیوں کہ نتیجہ فعل کے خلاف نہیں نکلا کرتا۔

باطل کے وجود کی حکمت (۱)

یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز سے اس کی ضد بھی پیدا

---

(۱) مصنف علیہ الرحمہ نے یہاں باطل کے وجود اور آگے خیر و شر کے یکجا ہونے پر بحث اس لیے کی ہے کہ ظاہر نظر میں یہ مسائل دنیا کی مصلحت کے منافی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ان کا وجود بھی حکمت کے مطابق ہے۔ (مترجم)

کر لیتا ہے لیکن یہ وہ اپنی قدرت کی بدولت، اپنی مخلوقات کی کسی مصلحت اور کسی حکمت کے لیے کرتا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اعمال کی مماثل جزا کے قاعدے کے ساتھ ساتھ ہدایت کی راہیں کشادہ اور گم راہی کا شیرازہ منتشر کر دیا کیوں کہ رحمت وسیع اور سایہ کے طور پر ہے۔ اگر اس کی یہ حیثیت نہ ہوتی تو اس کا وجود ناپید ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

و رحمتی وسعت کل شیء (الاعراف:۱۵۶)

''میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔''

یہیں سے اللہ کے نام اللہ اور رحمٰن دونوں ہوئے۔ لہٰذا فرمایا گیا:

قُلِ ادْعُواْ اللّهَ أَوِ ادْعُواْ الرَّحْمَـنَ أَيّاً مَّا تَدْعُواْ فَلَهُ الأَسْمَاءُ الْحُسْنَى (بنی اسرائیل:۱۱۰)

''کہہ دو کہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

ایک جگہ فرمایا:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (الانبیاء:۱۸)

''بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تم دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا۔''

یہاں چہ حق وہ ہے جس کا وجود واجب ہے، خواہ وہ قدیم ہو، جیسا کہ خداوند واحد وقہار ہے، خواہ وہ حادث ہو۔ پس اس نے اپنی رحمت کے تقاضے سے ہمیں پیدا بھی کیا اور نعمتیں بھی عطا کیں۔

نفسِ انسانی میں خیر اور شر کے دو پہلو

خلق کے دو پہلو ہیں: ایک تاباں دوسرا تاریک، ایک خیر اور دوسرا شر۔ تاباں

اور خیر پہلو رب کی طرف نسبت کے پہلو سے ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا:

اَحۡسَنَ كُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ (السجدۃ:۷)

''اس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے۔''

اس پہلو سے خلق شر نہیں ہوتی۔ رہا دوسرا پہلو تو وہ نفس کی طرف نسبت سے ہوتا ہے۔ چوں کہ وہ حق کا غیر ہے، اس کا یہ غیر ہونا شر ہے۔ لہٰذا شر سے بھاگنا واجب ہوا اور ہمیں عمومی طور پر خلق کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی۔ فرمایا:

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ (الفلق:۱-۲)

''کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی ہر اس شے کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے۔''

شر کے وجود کی حکمت

اللہ تعالیٰ نور ہے جیسا آیت اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) میں فرمایا۔ وہ نور کی پرورش کرتا ہے۔ اس نے تاریکی کو پیدا کیا تو کسی مصلحت سے۔ پس تاریکی کسی دوسری چیز کی خاطر پیدا کی گئی جیسا کہ فرمایا:

فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ وَ جَعَلَ الَّیۡلَ سَكَنًا (الانعام:۹۶)

''وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی۔''

معلوم ہوا کہ رات اپنی تاریکی کی خاطر نہیں بلکہ ایک مصلحت کی خاطر پیدا کی گئی۔ چوں کہ اللہ خلق کا رب ہے لہٰذا وہ اس کو بڑھاتا ہے اور اس کی نشو ونما کرتا ہے۔ رہی تاریکی تو اللہ تعالیٰ اس کو اس خیر کے لیے مہلت دیتا ہے جو اس نے اس کے اندر رکھ دی ہے۔ لیکن تاریکی [illegible] مصلحتیں [illegible] ہو

اس میں سے برآمد ہو رہی ہیں، مٹ جائیں گی اور اس طرح خیر کا وہ پہلو مٹ جائے گا، جس کی وہ نشو ونما فرماتا اور جس کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النحل:۲۵)

''وہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ خدا چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ (الکہف:۵۸)

''اور تمہارا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ اگر وہ ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا۔''

اس سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ یہ مضمون یوں ادا ہوا ہے:

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَلٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى (فاطر:۴۵)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک معین مدت تک مہلت دیتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے عرصۂ حیات کا تعین اس لیے فرمایا ہے کہ ان کے اندر جو خیر مخفی ہے اس کو وہ ظاہر کردے۔ یہ تمام تر عاقل و مختار نفس کی تربیت کے لیے ہے کیوں کہ ایسے نفس کی مثال وہ پھول ہیں جو ان پودوں پر اُگتے ہیں اور وہ جواہر ہیں جو ان پتھروں میں پائے جاتے ہیں۔ حکمت اس کی دولت ہے اور وہ اس دولت کے پانے کے لیے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دینے میں جلدی کرنا چاہتا تو اس کو ہلاک کرتا اور اس طرح وہ ساری مخلوق کو بھی ہلاک کر دیتا جو

انسان کی مدد کے لیے پیدا کی گئی۔ چوں کہ اس نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ اپنی ہر مخلوق کو مہلت حیات دے کیوں کہ وہ انسان کے نفع کے لیے ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرۃ:۲۹)

''اس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔''

اس سے زیادہ وسعت کے ساتھ یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:

وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا۝ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۝ وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۝ وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا۝ وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا۝ وَالْاَرْضِ وَ مَا طَحٰهَا۝ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا۝ (الشمس:۱-۸)

''شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے اور دن جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے ڈھانک لے۔ اور شاہد ہے آسمان اور جیسا کچھ اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا کچھ اس کو بچھایا اور نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔''

یہاں نفس اور اس کے اختیار کو آخری مقصد کے طور پر بیان کیا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کی تخلیق سب سے آخر میں اس وقت کی گئی جب دوسری تمام کائنات وجود میں آ چکی تھی۔ جس طرح خلق دو پہلو رکھتی ہے اسی طرح خداوند تعالیٰ نے اس کے اندر فلاح کے اسباب کو استعمال کرنے اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ان الفاظ کے بعد خلقت میں تاریکی کے پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

حکمت رحمت کی تکمیل ہے

پس نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت کا وجود لازمی ہے۔ یہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ وجود میں رحمت کا ہونا واجب ہے، اس کے بغیر وہ باطل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت ہی کے باعث خلق کا مقصود اور اس کی ہدایت رحمت ہی کو بنایا ہے۔ اس نے انسانوں پر انعام کیا اور اپنی رحمت کی تکمیل کی۔ اس کی تمام نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت حکمت ہے، جو تمام امور کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور اسی کے سہارے آسمان و زمین قائم ہیں۔ پس حکمت ہی آغاز، درمیان اور انجام ہے۔ یہی حقیقی رحمت، نعمت اور لذت ہے۔ یہی خواہشات کی ناپاکی کی طہارت اور ظلوم و جہول اور برائی پر اکسانے والے نفس کی آلودگیوں کا تزکیہ ہے۔ اسی کی تعلیم کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے۔ اس نے انسانوں کو درجہ بدرجہ بلند کیا۔ حتی کہ علم لدنی کے حامل، کمال انسانی کی غایت، خاتم الرسل نبی امی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس کو محکم کیا۔ اس نے حکمت کی تعلیم کو آپ کے ہاتھوں کامل کیا اور آپ کا نام احمد اور محمد رکھا۔ چوں کہ جس کو سب سے بلند و برتر نعمت سے نوازا جائے وہ رب کی انتہائی حمد کرتا ہے۔ لہٰذا حضور کئی لحاظ سے محمد ہو گئے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

باب ۳:

حکمت کی تعلیم اور اس کا حصول

رسول اللہؐ کے فرائض میں تعلیم حکمت

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ہمیں حکمت سے روشناس فرمایا ہے، اس کی عظیم قدر و منزلت بتائی ہے اور اس حقیقت کے بیان میں متعدد پہلوؤں سے رہ نمائی دی ہے کہ حکمت اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے انعاموں میں سے ایک ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے چار مقامات پر جن چار صفات سے متصف کیا ہے ان میں آپ کی تعلیم کی انتہا تعلیمِ حکمت کو قرار دیا ہے۔ پہلا مقام وہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یوں بیان فرمائی ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرۃ:۱۲۹)

"اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔"

دوسرے مقام پر اس دعا کی قبولیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا

وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (البقرۃ:۱۵۱)

''چناں چہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

تیسرے مقام پر مومنین پر اپنا احسان بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

(آل عمران:۱۶۴)

''یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گم راہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

چوتھے مقام پر لوگوں کو اس بات پر کہ انہوں نے اپنے رب کے عظیم فضل کی قدر نہیں پہچانی، متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ

يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ (الجمعۃ:۲-۴)

''اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور انہی میں سے ان دوسروں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں اور اللہ غالب وحکیم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

یہ چار مقامات اگر چہ تین مختلف سورتوں میں آئے ہیں لیکن ان کی تعلیم ایک جیسی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تزکیہ کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے آخر میں ہوا ہے جب کہ باقی مواقع پر وہ پہلے ہے۔ اس تقدیم وتاخیر کا راز کیا ہے۔ اس کو تو ہم کسی مستقل فصل میں بیان کریں گے لیکن ان چار صفات کا تکرار ان کی زبردست اہمیت کی دلیل اور غور وفکر کا متقاضی ہے۔

جہاں تک تلاوت آیات کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر جو آیات نازل فرمائیں، جن کا آپ کو حکم دیا اور جن پر آپ کو اور آپ کی امت کو ابھارا، آپ ان کو آگے پہنچاتے۔ چناں چہ آپ کی امت کی مانند کلام اللہ کی تلاوت سے شغف رکھنے والی کوئی امت پہلے نہیں گزری۔ رہا تزکیہ تو یہ دین کا مقصود ہے۔ اس کی بنیاد توحید ہے اور توحید کا کمال اطاعت میں اخلاص اور خداوند تعالیٰ کی رضا کے لیے مال وجان کی قربانی ہے۔ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ نفوس کے تزکیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جہاں تک پہنچے آپ سے پہلے کوئی دوسرا نبی وہاں تک نہیں پہنچا۔ آں حضرت ﷺ کی تیسری صفت تعلیم کتاب ہے۔ ان احکامِ شریعت کی تعلیم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب کیے اور نبی ﷺ نے ان کو پوری تفصیل سے اپنے اصحاب پر واضح فرمایا، ان کے اصول وفروع کی طرف خود بھی رہ نمائی دی اور اپنے فقہاء صحابہ کو بھی

اس پر مامور فرمایا۔ چناں چہ وہ امت کے لیے نمونہ بن گئے۔ رہی حکمت تو آپ نے عقلوں کی تہذیب اور نفوس کے تزکیہ کے ذریعہ اس کی راہ بتلائی۔ لیکن کسی کو حکمت منتقل کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بکثرت مشق کرائی جائے، فہم کے لیے روشنی مہیا کی جائے اور کتابِ الٰہی میں غور و فکر پر برابر ابھارا جائے کیوں کہ وہی حکمت کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے اگر چہ بکثرت لوگ حکمت سے فیض یاب ہوئے لیکن اس کو آگے منتقل کرنے میں انہوں نے مشکل محسوس کی، چناں چہ وہ اسے اس طرح منتقل نہ کر سکے جس طرح انہوں نے احکامِ شریعت کو منتقل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امت میں حکمت جاننے والے کم ہو گئے اور اس کے حصول کا ذریعہ بھی مخفی رہ گیا۔

اہلِ حکمت کی قسمیں

جس طرح بعض حکیم ایسے ہوتے ہیں جن کو نہ صرف فہم حاصل ہوتا ہے بلکہ ان کی رائے بھی درست ہوتی ہے، اسی طرح بعض کلام نصیحت کے کلمات اور اعلیٰ اخلاق دونوں کو سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض حکیم اس خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کو حکمت کی تعلیم اور صحیح سوچ اور سچی بات کی طرف رہ نمائی دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض علوم کی نوعیت بھی یہ ہے کہ وہ فہم اور استدلال کے اصول سے آگاہ کرتے، حقیقی معارف کی راہ دکھاتے اور وہ طریقہ بتاتے ہیں جس سے بندہ طبیعت کی آلودگیوں سے پاکی حاصل کر سکتا ہے۔

جس طرح ہر تندرست آدمی طب کا جاننے والا نہیں ہوتا اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر صاحب حکمت آدمی حکمت کا واقعی علم بھی رکھتا ہو۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر صاحبِ علم اپنے علم سے دوسرے شخص کو واقف کر سکے کیوں کہ تعلیم ایک مشکل کام ہے اور طویل مشغولیت چاہتا ہے، لہٰذا حکیم کبھی تو اپنی ذاتی مصروفیت کے باعث حکمت کی تعلیم پر قادر نہیں ہو سکتا اور کبھی یہ مشکل پیش آتی ہے کہ مطالب کو طالب علم کے لیے

وہ پوری وضاحت اور خوبیِ بیان کے ساتھ ادا نہیں کر پاتا۔

اس فرق کے علاوہ کہ جو حکمت کی تعلیم دینے والے حکیم اور تعلیم نہ دینے والے حکیم کے درمیان ہے، یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ بہت سارے لوگ جو حکمت کی تعلیم دیتے ہیں خود حکیم نہیں ہوتے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے شہد کی بوتل میں شہد کی مٹھاس نہیں ہوتی یا کتاب کا ورق اس چیز کا خود عالم نہیں ہوتا جو اس میں لکھی ہوتی ہے لہٰذا اس طرح کا استاد حکیم کے اقوال کا ناقل یا کتابوں کا بوجھ اٹھانے والا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے علماء کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ انہیں تورات اٹھوائی گئی، لیکن انہوں نے اس کو اٹھا کر نہیں دیا۔ بالکل اسی طرح حکمت کی تعلیم دینے والے یہ لوگ صرف کلمات حکمت کی باتیں سنانے والے ہوتے ہیں اور اس کام کو سیکھنا کچھ مشکل امر نہیں۔

حکمت کے اصول کے ذرائع

جہاں تک اس حکمت کا تعلق ہے جو بصیرت اور فہم پیدا کرتی ہے تو حقیقی حکمت وہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائے خاص ہوتی ہے، جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ البتہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک صد اور اس کے لیے رکاوٹ بنائی ہے، اسی طرح اس نے ہر چیز کے لیے ایک ذریعہ اور راستہ بھی پیدا کیا ہے۔ پس جو شخص حکمت کا طالب ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے ذرائع کو اختیار کرے۔ اس کے دروازوں میں گھس جائے، اس کے حصول کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرے، اور اللہ تعالیٰ سے اسے مانگے، اس کے لیے وہ اس کے حضور سائل بن کر کھڑا رہے اور اس کی تسبیح کرتا ہو اس کے آگے سجدہ ریز ہو۔ وہ یقین رکھے کہ حکمت چوں کہ خدا کی جانب سے ایک نور ہے، اس لیے خدا کے سوا کوئی اسے عطا نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا، جس میں وہ تمام صفات اور اعمال بتائے ہیں، جن کے ذریعے سے حکمت حاصل ہوتی ہے۔ ہم ان میں سے بنیادی چیزیں یہاں

بیان کرتے ہیں:

پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی توجہ ہے جو خشیت، محبت اور عاجزی کے ساتھ ہو۔ یہ ایک تو نصف شب کی نماز سے حاصل ہوتی ہے جب تمام انسان سو رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ ٹھیر ٹھیر کر اور غور و فکر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتی ہے۔ دوسری چیز لوگوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا سلوک اور ان کی خیر خواہی ہے۔ یہ دو چیزیں بہت سی اچھی صفات پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حکمت بھی نازل ہوتی ہے مگر اسی قدر جتنی وہ دینا چاہے اور جیسی وہ دینا چاہے لیکن یہ ہوتی حقیقی حکمت ہے نہ کہ اس کی نقل یا اس کا یاد کیا ہوا کوئی حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بنیادوں کی طرف رہ نمائی دی ہے۔ سورہ بقرہ میں انفاق کی ترغیب، اس کی کچھ تمثیلات کے بیان اور انفاق کو خدا کے فضل اور نور کا ذریعہ بتانے کے بعد فرمایا:

يُؤتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيراً وَ مَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُو الْأَلْبَابِ

(البقرۃ:۲٦۹)

''وہ حکمت عطا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر کا خزانہ دے دیا گیا اور یاددہانی تو بس اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔''

اس آیت کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو حکمت پانے والوں کی ضد ہیں اور بتایا ہے کہ وہ کیسے اس آدمی کی مانند ہوتے ہیں، جس کو شیطان کی چھوت نے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ ایک نہایت واضح بات ہے کیوں کہ رب کی طرف توجہ ہی سے نور کے دروازے کھلتے ہیں اور بندوں کے ساتھ ہمدردی اور شفقت وہ چیز ہے، جو دل کے پردے چاک کرتی ہے اور اس کو کشادگی عطا کرتی ہے

قرآن مجید نے یہ دونوں بنیادی چیزیں اس مقام پر بھی بیان فرمائی ہیں جہاں شراب اور جوئے کی نجاست کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نجس ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے لوگوں میں دشمنی ڈالتا ہے اور ان کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر اور انسانوں کا باہمی ہمدردی کا تعلق سارے معاملہ کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کے لیے خاص کر دیا تھا، یہی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ذکر اللہ اور رحم دونوں کی شرائط اور آداب ہیں جن کا خیال کم ہی لوگ رکھتے ہیں اور وہ لوگ تو بے حد کم ہیں جو ان دونوں صفتوں کو جمع کرتے ہوں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو شخص ذکر اللہ کا خیال رکھتا ہے وہ انسانوں کے ساتھ محبت سے غافل ہو جاتا ہے اور جو انسانوں کا خیال رکھتا ہے وہ ذکر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔

یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ جو شخص نماز کے آداب و شرائط کا زیادہ خیال رکھتا ہے وہی اس کی حقیقت سے غافل بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔ جو شخص ظاہر کی فکر میں لگ جاتا ہے وہ باطن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نماز کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی، اس کا خوف، اس کی محبت اور اس سے تسکین پانا ہے۔ یہ تمام جذبات دل کو نرم کیے بغیر نہیں رہتے۔ پس ایسے آدمی کے لیے لازم ہے کہ وہ خود رحم دل بھی ہو اور یہ بات بھی یاد رکھے کہ وہ ایک رحیم رب سے سوال کرتا ہے جو دشمنوں کے ساتھ دشمنی بھی رکھتا ہے۔ لیکن شیطان آدمی پر وہاں سے حملہ آور ہوتا ہے جہاں سے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف دیکھئے تو بندوں کے ساتھ فیاضی اور شفقت کرنے والے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ایسے لوگ کم ہی نماز ادا کرتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نمازوں سے بے نیاز ہے، پس وہ اپنے بندوں کے ساتھ رحمت و شفقت کو

پسند کرتا ہے۔ ایسے لوگ بھی رحم اور فیاضی کی حقیقت سے غافل ہیں، کیوں کہ رحم کا باطن اللہ کی خشیت ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ○ (المومنون:۶۰)

''اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔''

قرآن مجید کے بکثرت شواہد اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی اور بندوں پر شفقت دونوں ایک ہی اصل سے پھوٹتے ہیں۔ پس جو بندہ عاجزی اور خلوص کے ساتھ خدا کی طرف اور شفقت و ہمدردی کے ساتھ اس کے بندوں کی طرف توجہ کرتا ہے وہ وفاداری اور خدا ترسی کے دروازے میں داخل ہوگیا اور اس نے اپنے رب کو راضی کرلیا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی امید ہے کہ وہ اس کے دل کو روشن کردے گا، اسے اپنی خوشنودی کے راستوں کی ہدایت دے گا اور اس کی نظروں میں وہ چیزیں محبوب بنا دے گا جو اس کو پسند ہیں اور یہی حکمت کی حقیقت ہے، باقی معاملات کی اصلیت کا علم تو خداوند تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

حکمت پانے کے لیے اہلیت ضروری ہے

اوپر آیت يُؤْتِي الْحِكْمَةَ .... الخ میں یہ جو فرمایا کہ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُو الْاَلْبَابِ (نہیں نصیحت پاتے مگر اہلِ عقل) تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو اہل عقل نہیں ہیں وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ حکمت کیا ہے۔ اگر وہ حکمت کو جانتے ہوتے تو انہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ حکمت کے اہل کون ہیں اور یہ کہ حکمت اہلِ عقل کے لیے خاص ہے اور جو اہل نہیں وہ اس حقیقت کو کبھی نہیں سمجھتے کہ حکمت کیا ہے

ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ حکمت کی اصل ایمان ہے اور ہر بندۂ مومن دوسرے لوگوں کی نسبت سے زیادہ حکمت کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ نام کا اطلاق عادت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ پس حکیم وہ شخص کہلائے گا جس کو حکمت کا وافر حصہ ملا ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی شخص کو اس وقت تک عالم نہیں کہا جاتا، جب تک وہ علم کا وافر حصہ نہ رکھتا ہو۔

قرآن مجید نے یہ صراحت کی ہے کہ نبی ﷺ نے کتاب اور حکمت کی تعلیم دی تھی۔ لہٰذا اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ علمائے صحابہؓ نے جس طرح قرآن مجید حاصل کیا اسی طرح انہوں نے حضورؐ سے حکمت بھی سیکھی۔ لیکن ایسے صحابہؓ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ بعد میں تعداد اور کم ہوتی گئی۔ جوں جوں امت زمانہ نبوت سے دور ہوتی گئی، اسی اعتبار سے حجابات حکمت کے نور کو ڈھانپ دیتے رہے۔ آیئے دیکھیں کہ حکمت کیسے اٹھالی گئی۔

صحابہ کرامؓ کے دور کے بعد علم میں مشغولیت کے لحاظ سے امت تین گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ پہلا گروہ ان لوگوں کا تھا جو قرآن مجید پر غور وفکر، اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول ہوئے۔ ان کو اس سے ہٹانے والی کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ علماء میں یہ لوگ حکمت کا زیادہ حصہ پاسکے اور اس کی حقیقت کو بھی سب سے زیادہ سمجھنے والے ہوئے۔ ان کے درمیان صلاحیتوں کے فرق کے لحاظ سے فرق موجود رہا۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو نبی ﷺ کی سنت اور حدیث کی روایت میں مشغول ہوئے۔ ان کی مصروفیت آں حضرتؐ کی احادیث اور صحابہ کرامؓ کے آثار کو جمع کرنے اور ان پر تنقید کرنے تک محدود رہی۔ انہوں نے اس میدان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی یہاں تک کہ انہوں نے ہر وہ دروازہ بند کر دیا، جس کے راستے سے بدعت یا تحریف اسلام میں گھس سکتی تھی، جس کا تجربہ سابقہ ملتوں کو ماضی میں ہو چکا تھا۔ دین میں ان لوگوں کے عظیم مرتبہ اور ان کے تقویٰ (جو حکمت ہی کا ایک دوازہ ہے) کے باوجود ان کی توجہ حکمت کے دوسرے

دروازوں کی طرف کم رہی، لہٰذا ان پر حکمت کا مفہوم گڈمڈ ہوگیا۔ انہوں نے یہ گمان کرلیا کہ آیت یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (رسول ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) میں حکمت سے مراد علم حدیث ہے لہٰذا انہوں نے اس پر اپنی پوری توجہ صرف کردی۔ یہ بات شاید امت کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوئی کیوں کہ ان علماء نے علم حدیث کی طلب میں جب تمام قوت لگادی تو وہ اس میدان میں اس بلند مقام تک پہنچے جس کے عشر عشیر تک بھی ان سے پہلے یا بعد کی کوئی امت نہیں پہنچ سکی۔ اگر چہ یہ لوگ اس اصل حکمت کے حصول کے درپے نہ ہوئے جس کی رہ نمائی قرآن میں ہے، لیکن انہوں نے فلسفہ سے اجتناب کیا جو حکمتِ الٰہیہ کی ٹھیک ضد ہے۔ لہٰذا ان علماء کو بھی حکمت کا ایک حصہ مل گیا۔ اگر چہ انہیں یہ شعور نہیں ہوا کہ یہ حکمت آئی کہاں سے۔ ان علماء کے طرزِ عمل میں ایک دوسری مصلحت بھی تھی۔ چوں کہ انہوں نے رائے اور قیاس کا انکار کیا، اس لیے حدیث کے جمع اور تنقید کے کام میں یہ تہمت سے بچے رہے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے یونان کے فلسفہ و کلام میں دلچسپی لی اور گمان کرلیا کہ یہ وہ حکمت ہے، جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ یہ لوگ حکمت الٰہیہ سے بالکل فیض یاب نہیں ہوسکے۔

افرادِ امت کی فرائض نبوی سے مطابقت

رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی سے مطابقت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو افرادِ امت میں قاری اور حافظ قرآن پہلی صفت ــــ تلاوتِ آیات ــــ کا مظہر ہیں۔ صوفیا اور ان کے ہم مشرب، ایسے عابد و زاہد لوگ جو کتاب و سنت کا دامن پکڑے رہتے ہیں، دوسری صفت ''تزکیہ'' کے حامل ہیں۔ احکام شریعت پر غور کر کے استنباط مسائل کرنے والے فقہاء اور راویانِ حدیث، تیسری صفت ''تعلیم کتاب سے نکلنے والی فرع ہیں۔ رہی چوتھی صفت ''تعلیم حکمت'' تو صحابہ کرامؓ کے بعد اس کے حامل بہت کم ہوئے۔ اس کی وجہ ہوئی کہ جب امت مسلمہ پر دنیا کے دروازے کھل گئے تو باہم جھگڑے اور

بحثوں نے ان پر غلبہ پالیا۔ اس کے نتیجہ میں خلافت اور حکمت ان سے سلب کرلی گئی اور ان کے بجائے خلافت کی جگہ ملوکیت اور حکمت کی جگہ فلسفہ دے دیا گیا۔ امتِ مسلمہ تیرہ صدیوں سے بھٹک رہی ہے۔ ممکن ہے کہ عنقریب خلافت اس کو واپس مل جائے جس کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم کے افق سے حکمت کے طلوع ہونے کی علامات بھی ظاہر ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں صدی کے اختتام پر سپیدۂ صبح کی نمود ہونے والی ہے۔

اس صورت حال کی طرف اشارات قرآنِ مجید میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام صفات میں تعلیم حکمت کے ذکر کو مؤخر کیا گیا ہے۔ دوسرے سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ○ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ○ (الجمعۃ:۳،۴)

''اورانہی میں سے ان دوسروں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں اور اللہ غالب وحکیم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

یہاں اہلِ حکمت کی طرف اشارہ واضح ہے کیوں کہ حکمت کے لیے بھی اسی طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، فرمایا:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرۃ:۲۶۹)

''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔''

نبی ﷺ نے اس امت کی مثال ان الفاظ میں دی۔

مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ خیر ام آخرہ (۱)

''میری امت کی مثال یوں ہے جیسے بارش، جس کے متعلق معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا ابتدائی حصہ زیادہ اچھا ہوگا یا آخری حصہ۔''

یہ مضمون قرآن مجید میں اہل جنت کے طبقات کے بیان میں ان الفاظ میں آیا ہے:

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ○ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ○ (الواقعۃ:۱۳،۱۴)

''ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہوگی اور تھوڑے پچھلوں میں سے ہوں گے۔''

خلاصۂ بحث

حکمت کے ان مباحث سے میں نے جو بات واضح کرنی چاہی ہے، اپنے قارئین کو سمجھانے کی غرض سے میں اس کے نکات دوسرے قالب میں بیان کرتا ہوں۔ یہ نکات اس طرح ہیں:

۱۔ حکمت کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی اصل کیا ہے اور فرع کیا؟

۲۔ مرتبہ اور زمانہ کے لحاظ سے اس کا مقام کیا ہے؟

۳۔ عقائد اور اعمال کی صحت کا دارومدار حکمت پر ہے۔

۴۔ حکمت عقائد اور اعمال کو مرتب کر دیتی ہے۔ ہر چیز کو اس کا جائز مقام دیتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ واضح کرتی ہے۔ لہٰذا یہ تمام علوم اور اعمال کا نظام اور ان کو وجود میں لانے کا ذریعہ ہے۔ حکمت کے بغیر دین کا زیادہ تر حصہ غائب ہو جاتا ہے۔ بلکہ خالی صورت کے سوا اس میں کچھ نہیں پہنچتا۔ حتی کہ کبھی وہ اس طرح پارہ پارہ ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں رہ جاتی جس پر دین کے نام کا اطلاق کیا جا سکے۔ چناں چہ دین کی جگہ انکار اور ایمان کی جگہ کفر لے لیتا ہے۔

(۱) جامع الترمذی: کتاب الامثال، باب ٦

۵- اس کتاب میں ہمارے پیش نظر جو اہم مطالب ہیں ان میں ہم عقائد کی ترتیب اور ان کی باہمی نسبت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اعمال کی وضاحت بھی کرنا چاہتے ہیں تاکہ عمل کا طریقہ ہموار ہو اور عقائد صحیح اور محکم ہوں۔ ہمارے نزدیک نبی جو حکمت لے کر آئے اور جس کی آپ نے تعلیم دی، اس کا مقصود اصلی یہی تھا۔

☆☆

باب ۴:

حکمت اور قرآن حکیم

حکمت اور نظمِ قرآن کا باہمی تعلق

قرآن مجید کا نظم بے شمار پہلوؤں سے حکمت کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ لہٰذا جو شخص نظم پر غور کرے گا لازم ہے کہ اس کی رسائی گہری حکمتوں تک ہو جائے۔ اب ہم قرآن مجید کی رہ نمائی کے ایک خاص پہلو پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ نظم قرآن کی تلاش بھی حکمت پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمت کے دروازے سے داخل ہو کر ہی نظمِ قرآن تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے، جو شخص غور کرنے کے اس انداز سے محروم ہے وہ نظم قرآن کو نہیں پا سکتا۔ بلکہ یا تو وہ اس کا انکار کر دے گا یا اس سے بعد محسوس کرے گا۔ لیکن جس شخص کو یہ یقین ہو کہ قرآن ایک منظم کتاب ہے اور وہ اس میں نظم کا تلاش کرنے والا ہو تو یہ جستجو اس کو حکمت کے دروازوں تک لے جائے گی۔ اس طرح وہ مقصد تک رہ نمائی حاصل کر سکے گا۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کے حق میں نصِ قرآن موجود ہے۔

اس امر کی تفصیل یوں ہے کہ مختلف امور کو منظم کرتے وقت ان کے بلند اصولوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جب تک ایک شخص کی نظر امور کے اختلاف ہی میں الجھ کر رہ گئی ہو اور اس سے بالاتر نہ ہو سکی ہو تو وہ ان کو بے جوڑ اور متفرق پائے گا، لیکن جب اس کی نظر اصول تک پہنچ جائے تو وہ مختلف امور کی ایک دوسرے کے ساتھ

مناسبت کو جان جائے گا۔ اس حقیقت کی طرف رہ نمائی سورۂ زخرف کی اس آیت سے ملتی ہے:

وَ اِنَّهٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ؕ (الزخرف:۴)

''اور بے شک یہ (قرآن) اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، نہایت بلند اور پر حکمت۔''

قرآن مجید کے بلند ہونے کی صفت اس کے حکمت سے متصف ہونے کو لازم ہے۔ حکمت ایک طرف مختلف امور کے لیے سمائی اور احاطہ کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف متقابل اور منتشر امور کو ایک جامع نظام کے تحت لاتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کو ترتیب دے اور ایک نظم میں بھی پرو دے۔ چوں کہ حکمت کا مفہوم ہی پختہ کرنا اور یقینی بنانا ہے، اس لیے جب کلام کی عمارت ہی غلط طور پر اٹھائی گئی ہو اور اس کے اجزا میں ترتیب کی خرابی پائی جائے تو یہ بات حکمت کے منافی ہے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کی خاطر قرآن مجید کے لیے عزیز اور حکیم کی صفات آئی ہیں۔ اسی حقیقت پر استدلال کرتے ہوئے کبھی یوں فرمایا ہے کہ یہ کتاب ایک حکیم ذات کی جانب سے ہے مثلاً:

وَ اِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیۡزٌ ۙ لَّا یَاۡتِیۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَ لَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ (حم السجدۃ:۴۱-۴۲)

''بے شک یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے، اس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم وحمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری گئی ہے۔''

اس آیت میں قرآن کی مضبوطی کو تو 'عزیز' ہونے کے حوالے سے ایک نص سے بیان کیا، جب کہ اس کی حکمت کو خدائے حکیم کی صفات کا تقاضا قرار دیا کیوں کہ

حکیم کبھی ایسا کلام نہیں کہتا جس تک باطل کا ہاتھ پہنچ سکتا ہو، جب اس کی اپنی ذات میں اور اس کے بنائے ہوئے نظام میں کوئی خلل نہیں تو اس کے کلام میں کیسے نقص ہوسکتا ہے؟ اس آیت میں حمید کی صفت لاکر کلام کے حسن کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

حکمت نظمِ قرآن میں پوشیدہ ہے

علم کی وسعت اور بلندی کے ساتھ ساتھ اگر اخلاق میں پاکیزگی اور دِل میں کشادگی پیدا نہ ہوتو اِس کا سبب دل کی عدم آمادگی اور خباثت ہوتی ہے۔ ہر اقدام اور روگردانی کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ دل جب علم کی موافقت اختیار کرنے سے روگردانی کرتا ہے تو اس کا اثر دل کی سختی میں اضافہ اور اس کی تاریکی کی صورت میں نکلتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

فَلَمَّا زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُم (الصف:۵)

”تو جب وہ کج ہوگئے تو اللہ نے ان کے دل کج کردیے۔“

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (النساء:۱۵۵)

”بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کردی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے۔“

یہ ایک واضح اور مضبوط بنیادی حقیقت ہے۔ اسی کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حکمت کو نظم کلام کے اندر چھپا دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کو کلام کے ظاہر میں نمایاں فرما دیتا اور پوشیدہ نہ رکھتا تو اس کا نقصان بہت شدید ہوتا، کیوں کہ واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد اعمال و اخلاق میں سے جو کچھ اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے وہ بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لہٰذا اگر حکمت ظاہر ہوتی تو خطرہ تھا کہ عام لوگ اسے قبول نہ کرتے اور اس کو جھٹلا دیتے۔ تعلیم میں جو تدبیر ملحوظ رکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آسان سے مشکل کی طرف درجہ بدرجہ بڑھا جائے، چناں چہ اسی بنیاد پر شریعت کی تعلیم سنت کی طرف

پھیر دی گئی، اور حکمت کو موقع کلام میں غور و تدبر کی طرف پھیر دیا گیا، تاکہ جوں جوں واقفیت بڑھے، اس کے نتیجہ میں درجہ بدرجہ عمل اور اخلاق میں بھی قدم بڑھیں، پس کسی ایسے شخص کو حکمت عطا کرنا جس کے اخلاق پاکیزہ نہ ہوں، اور جو بلندی کی طرف جانے کی جدوجہد نہ کرتا ہو، محض حکمت کو ضائع کرنا ہی نہیں ہوتا، بلکہ یہ چیز دل کے غرور اور سختی میں اضافہ کرتی اور نتیجتاً سستی اور ظلمت پیدا کرتی ہے۔

قرآن مجید نے مذکورہ دونوں باتوں سے ہمیں آگاہ فرما دیا ہے۔ چناں چہ اس نے بہت سی آیات میں ہمیں نبیﷺ کی پیروی اور آپ کے عمل کو اپنے لیے نمونہ بنانے کی تلقین کی، اس کی ہمیں رغبت دلائی اور اس کی مخالفت سے بچنے کا حکم دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہمیں ترغیب دی ہے کہ ہم آں حضرتؐ کی سنت اور پسند یا ناپسند کاموں میں آپ کے طریقہ کی جستجو کریں۔ تاکہ ہمیں اپنی ضرورت کے امور میں احکامِ شریعت کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ ٹھیک اسی طرح قرآن مجید نے ہمیں بے شمار آیات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے عجائبات میں غور کرنے کا حکم دیا اور اس کے متعدد پہلو بیان کیے جن سے خدا کی حکمت اور رحمت کی طرف رہ نمائی ملتی ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ ہم علم میں پختہ ہوں اور اس کے نتیجہ میں ہمارے ایمان، حکمت، نور اور بصیرت میں اضافہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبیﷺ نے جس طرح شریعت اور ظاہری احکام کی تعلیم دی، اسی طرح حکمت کی تعلیم بھی دی۔

حکمت کی پہچان کا طریقہ

جب آپ کسی چیز کو پہچان جاتے ہیں تو پھر یہ بات آپ کے لیے مشکل نہیں رہ جاتی کہ آپ اس کے مختلف پہلوؤں، اس کے اثرات، اسباب، علامات اور اس سے ملتی جلتی ہوئی یا اس سے مختلف چیزوں کو پہچان جائیں۔ پہچان کے بعد آپ کو وہ الفاظ و مضامین بھی مل جاتے ہیں، جن سے آپ اِس چیز کے ناموں، اس کی صفات، اس کے

افعال اور اس سے ملتی ہوئی یا مختلف چیزوں کو تعبیر کریں۔ یہ مرکز سے اطراف پر غور کرنے کا طریقہ ہے جو نہایت واضح اور استعمال میں ہے۔ اس کے بالمقابل طریقہ یہ ہے کہ آپ اطراف سے مرکز کی طرف بڑھیں، اور ایک حقیقت کو اس کے مختلف پہلوؤں، اس کے اسباب، علامات اور لوازم وغیرہ کی روشنی میں تلاش کریں۔ ایک محقق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں طریقوں کو استعمال میں لائے۔

جہاں تک حکمت کا تعلق ہے قرآن نے اس کو پہچنوانے کے دونوں طریقے استعمال کیے ہیں۔ متعدد مقامات پر اس نے صراحت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ فلاں چیز حکمت میں سے ہے۔ اہل زبان نے حکمت کے مفہوم کو بھی واضح کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اسباب کی بنا پر لوگوں نے حکمت کی پہچان میں غلطی کی ہے۔ انہوں نے اس کے نام کا اطلاق دوسرے معانی پر یا اصل معنی کے کسی جزوی پہلو پر کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو اس کے ثمرات میں سے کچھ حصہ اور اس کی چمک دمک میں سے کوئی کرن ہاتھ لگ گئی، لیکن انہیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ حکمت میں سے ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص کو نہایت عمدہ اور قیمتی موتی ہاتھ لگ جائے لیکن وہ اس کی قدر و قیمت سے بے بہرہ ہو۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہے جس کو تقویٰ اور امانت کی خلعت عطا کی گئی ہو اور وہ اس کو پانے کے بعد دنیا کی زیب و زینت کی طرف متوجہ ہوگیا، دنیا کا حقیر اور ناپاک ہونا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور وہ دنیاداروں پر رشک کرنے لگا، گویا اس کی نگاہ ان مفاسد پر نہیں پڑی جو ان دنیاداروں نے اپنے لیے سمیٹ لیے ہیں۔

ایک عارف حکیم کا طریقہ یہ نہیں، بلکہ وہ حکمت کے سرچشمہ پر پہنچتا ہے تو اس سے سیراب ہوتا ہے، اس کی ٹھنڈک اور لذت سے فیض یاب ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اس کے برعکس جب وہ دنیاداروں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کی حالت پر اسی طرح ترس کھاتا ہے، جس طرح کوئی شخص کسی انسان کو مردار کھاتے یا نجاست میں

آلودہ ہوتے دیکھے تو اس پر اسے ترس آتا ہے۔ پس حکیم وہ ہے جس کو سمجھ عطا ہوئی۔ اس نے حق کو پہچانا اور اس پر مطمئن ہوگیا، وہ باطل سے دور رہا اور اسے اپنی عزت اور پاکیزگی کا شعور حاصل رہا۔ یہی شخص صبر اور شکر کی صفات سے واقعتاً متصف ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام و حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ اور نبی کریمﷺ تک تمام انبیاء اور ان کے رفقاء و اصحاب کے اخلاق کو یاد کیجیے، پھر ان لوگوں کو یاد کیجیے جو ان کی پیروی کرتے رہے، اور خدا سے ڈرنے والے، حق کے لیے آنکھیں کھولی رکھنے والے اور کتاب و سنت کو لازم پکڑنے والے ہوئے۔ ان سب نے باقی رہنے والے خیر کو اختیار کیا اور فنا ہونے والی ادنیٰ چیزوں میں ملوث نہیں ہوئے۔ پھر رب کریم سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کو نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین کے اس عالی مقام زمرہ میں جگہ عطا فرمائے۔

فطرتِ انسانی میں حکمت

وہ اصول جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیے ہیں، سب سے واضح ہیں لیکن ان کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص اگرچہ ظلم اور تکبر کی بنا پر ان کا انکار کر دیتا ہے تاہم جب اسے جھنجھوڑا جائے تو ان کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ان اصولوں کو پہلی ہی بار صراحت سے بیان کر دیا جائے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان کو نمایاں کیا جائے پھر درجہ بدرجہ ان کے تقاضے بتائے جائیں۔ یہ فطری اصول نہایت گہری جڑیں رکھتے ہیں، ان کو اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ یہ پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان کے تقاضے انسان کے ذہن سے اتر جاتے ہیں لہٰذا جو شخص ان پر متنبہ ہو جائے، اس کو ان کی بصیرت حاصل ہو جائے اور ان کی کمین گاہ کو پالے تو اسے ان اصولوں کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی نگاہوں میں کھب جاتے ہیں، اس کا فہم ان پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص گہری حکمت

کا مالک ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کے علم کو بھی پختگی حاصل ہوتی ہے اور اس کی فطرت بھی محکم ہوتی ہے۔ وہ اس درجہ کو اس لیے پالیتا ہے کہ اس نے فطری اصولوں کی پہچان کرلی اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ کسی چیز کی معرفت کا اطلاق اس حقیقی علم پر ہوتا ہے جو نفع بخش ہو اور جو آدمی کے فہم اور ارادہ سے ایک حقیقت کے طور پر ابھرا ہو۔

وہ معارف جن کو حکمت کا نام دیا جاتا ہے، بہت زیادہ نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت علم کے درخت کی بیج کی سی ہے۔ اس معاملے میں حکمت دوسری ان تمام قوتوں کی مانند ہے، جن سے بکثرت علوم و معارف پیدا ہوتے ہیں، مثلاً سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں یا ان کا ابتدائی ادراک۔ حکمت تمام بدیہی چیزوں میں سب سے زیادہ واضح ہے، اور جو چیز بدیہی ہوتی ہے اس کی حیثیت جڑ اور تنے کی ہوتی ہے۔ جس طرح آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ آپ کو روشنی کی بدولت نظر آتا ہے۔ لیکن آپ روشنی کو نہیں دیکھتے بلکہ ان اشیاء کے دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں، جو روشنی میں دکھائی دے رہی ہوتی ہیں یا جس طرح آپ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہیں تو خود آئینہ آپ کو نظر نہیں آتا جب تک خاص اہتمام سے اس کی جانب متوجہ نہ ہوں، ٹھیک یہی معاملہ حکمت کے طالب کو بھی پیش آتا ہے۔ اس کا منبع اس کی ذات کے اندر ہوتا ہے، اسے اس کی خاطر چل کر کہیں جانا نہیں پڑتا۔ لہٰذا اس کے لیے صحیح لائحہ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی طرف رجوع کرے اس کی فطرت اور اس کے عجائب پر غور کرے کیوں کہ یہی حکمت وہ نور ہے جس سے وہ اس کے گرد و پیش اور اوپر اور نیچے کو دیکھے گا۔ اسی سبب کی بنا پر اگلوں نے تمام معارف میں نفس کی معرفت کو سب سے اہم اور بنیادی سمجھا۔ وہ شخص کتنا بے خبر ہے جو اپنی ذات کے احوال سے تو غافل رہے لیکن دور کی چیزوں میں مشغول رہے؟

قرآن مجید کی حکمت کے حجابات

قرآن مجید نے اپنے فضل خاص سے حکمت کی کوئی بات بغیر بیان کیے یا

واضح کیے نہیں چھوڑی۔ اس لیے مسلمان حکمت کے متلاشی بنے اور انہوں نے کوئی ایسا گوشہ نہ چھوڑا جہاں اس کے مواقع کا گمان ہوسکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ حکمت جس کی قرآنِ حکیم نے ترغیب دی تھی پردے ہی میں رہی، اگرچہ وہ بالکل سامنے تھی۔ یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے حکمت کے لفظ سے کوئی دوسری چیز مراد لے لی اور پھر اسی پر قناعت کرلی۔ اس کے باوجود وہ اس سے پورے طور پر محروم بھی نہ رہے۔ یہ ایسا ہی ہے جس طرح کمزور بینائی والا آدمی دھوپ کی جانب تو نہیں دیکھ سکتا لیکن اس کی چمک اور روشنی محسوس کرلیتا ہے اور اس طرح وہ روشنی سے بالکل بے خبر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی تھی جس نے کوئی چیز ورثہ میں پائی لیکن اس کو پہچاننے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ جب اس کی جستجو کرتا ہے تو ہر اس چیز پر ہاتھ رکھ دیتا ہے جس کے بارے میں اس کا گمان ہو کہ یہی وہ چیز ہے جو اس نے ورثہ میں پائی، رہا وہ شخص جس نے کسی دوسرے کے پاس حکمت کی صفات پہچان لیں، اس کی علامات اس پر واضح ہوگئیں اور اس جیسی چیز خود اس کے اپنے پاس موجود تھی تو اس پر معاملہ مشتبہ نہیں ہوسکتا۔ جب وہ اس پر آگاہ ہوتا ہے تو حکمت کو شناخت کرلیتا ہے کیوں کہ اس جیسی حکمت اس کے اپنے پاس موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ شخص کھوئی ہوئی متاع کو پانے والا ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ الحکمة ضالة المومن (حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے)۔

مسلمانوں نے درج ذیل چند متعین علوم میں دلچسپی لی ہے۔ دیکھئے ان میں سے کس پر حکمت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

الف: علوم قرآن مثلاً تفسیر وقراءت

ب: حدیث مع اصول حدیث ورجال

ج: فقہ مع اصول وفروع

د: کلام، عقائد ومناظرہ

ھ: منطق

و: فلسفہ اور اس کی نظری و عملی شاخیں مثلاً طبیعیات، ریاضی، طب و فلکیات

ز: معیشت کے لیے نفع بخش علوم مثلاً صنعت و حرفت وغیرہ

ح: سیاسیات و تہذیب امم

ط: اثری علوم، تاریخ و سیرت

ی: تصوف

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والوں کے سوا علم کی ہر شاخ سے تعلق رکھنے والا شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے پاس حکمت کا ایک حصہ ہے۔ ان لوگوں کی اپنے اپنے علم میں مشغولیت ہی ان کے اور حکمت کے درمیان ایک حجاب بن گئی۔

☆☆

باب۵:

حکیم کا طرزِ فکر و تعلیم

حکیم کا طرزِ فکر

حکمت نفس کا کمال اور اس کا مقصود ہے۔ اس لیے یہی ابتداء اور یہی انتہا ہے، جن علوم سے حکمت کے حصول سے پہلے سابقہ پیش آتا ہے وہ اس کی معرفت کا ایک وسیلہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک آدمی پہلے جزئیات کا علم حاصل کرتا ہے، پھر ان سے مجموعی علم اخذ کرتا ہے، اس کے بعد اس مجموعی علم کی روشنی میں جزئیات سے علم کا دوبارہ جائزہ لیتا ہے تو ان جزئیات کا غلط یا صحیح ہونا اس پر روشن ہو جاتا ہے، اسی طرح حکمت حاصل ہونے کے بعد آدمی جب ان علوم کا جائزہ لیتا ہے جو اس کے حصول کا ذریعہ بنے تھے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں کئی باتیں خلط ملط اور بہت سے مسائل الٹ پلٹ ہو گئے تھے۔

کامل معرفت اور تحقیق کے بعد ظن و تخمین پر مبنی کئی امور درست کیے جا سکتے ہیں۔ جو امور غیر واضح ہوتے ہیں وہ بھی صاف ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو یوں لگتا ہے جیسے پچھلے لوگ ان تمام امور کو جانوروں کی نگاہ سے دیکھتے رہے تھے۔ جب ایک حکیم آیا تو اس نے پہلی مرتبہ انسان کی نظر سے ان کو دیکھا۔ دوسرے الفاظ میں اشیاء معانی و مفہوم سے اس وقت تک خالی رہیں جب تک کوئی ایسا شخص ان تک نہیں پہنچا، جس نے ان کو سمجھا، کھولا اور ان کی وضاحت کی۔ پس آدمی جب تک معرفت حاصل نہیں کرتا وہ ان

علوم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس کی تیاری کے لیے وضع ہوئے تھے۔ معرفت سے قبل ان سے فائدہ اٹھانا صحیح فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ اسی طرح ان کا علم بھی حقیقی علم نہیں ہے۔ بلکہ یہ علم بس متفرق قسم کے ادراکات اور گمراہ کن جذبات پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک حکیم کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے تمام احوال میں اسے پختگی اور نظم وضبط دکھائی دیتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ کائنات کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کا ایک خالق ہونا لازم ہے جو تمام امور کو اس خاص مقصد کی طرف لے جا رہا ہے۔ پس حکیم کا یہ اندازِ فکر علم اور عمل کے درمیان پختہ تعلق پر مبنی ہوتا ہے۔ جو شخص ایک حکیم خالق پر ایمان نہیں رکھتا وہ نہیں جانتا کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی مقصد بھی ہے۔ پھر جب وہ اپنے دل میں ارادہ، طبیعت میں میلانات اور اچھے اور برے میں امتیاز کی صلاحیتیں موجود پاتا ہے تو اسے اس بات پر اطمینان نہیں ہو پاتا کہ یہ سب چیزیں واقعی کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہیں۔ وہ ان کو تقلیدِ آباء یا روایت پرستی یا نفس کی مخفی اغراض کی طرف منسوب کرتا ہے اور ہر حال میں خیر اور شر کے وجود کے بارے میں بے اطمینانی کا شکار ہوتا ہے۔ اسے کسی چیز کے وجود اور عدمِ وجود کا اطمینان بھی حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ اسے اپنے مشاہدہ پر بھی یقین نہیں آتا۔ وہ فطرت کو الزام دیتا ہے۔ ایسا شخص عمل کرتا ہے تو اسے اس کے انجام کا علم نہیں ہوتا۔ وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جو ایک تاریک رات میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے برعکس حکمت علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں زندگی کے مقصد اور اس غایت کے بارے میں اطمینان پیدا ہوتا ہے جس کی طرف ساری مخلوق بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا حکیم شخص اپنے خالق کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے۔ جس نے ہر چیز کی تدبیر بڑی حکمت سے کی ہے، جس نے ہر مخلوق کے لیے ایک غایت اور حکمت مقرر کر رکھی ہے اور جس نے کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ایک حکیم خالق کوئی کام عبث نہیں کرتا۔ وہ دنیا کو جس طریقہ سے چلا رہا ہے اس پر ایک حکیم شخص کا راضی رہنا اس کی زندگی کا مقصد اور اس کی

فطرت کا کمال ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ایک شکر گزار، راضی برضائے الٰہی اور مطمئن نفس کا مالک بن جاتا ہے۔

حکیم کا طریقۂ تعلیم

حکمت چوں کہ واضح، تمام علوم کی نسبت نفس سے قریب تر اور عقل سے زیادہ مطابقت رکھنے والی، زیادہ پھیلاؤ نہ رکھنے والی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ پردوں میں چھپی ہوئی ہے، جس کی طرف توجہ نہیں ہونے پاتی، اس لیے اس کی تعلیم دینے والے حکماء کو اس کے معارف بیان کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ یہ معارف تو لوگوں کے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھے۔ انہیں دلچسپی اس بات سے ہوتی تھی کہ لوگوں کا رخ حکمت کی جانب پھیر دیں، ان کو غور و فکر پر آمادہ کریں اور ان کو ان تاریکیوں کے حجابات سے نکالیں جو ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے نفس کے دو افعال کا سہارا لیا: ایک فکر و استدلال اور دوسرا خیر و سعادت کی طرف تحریک۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے قوتِ فکر اور قوتِ ارادہ کو بیدار کیا۔ کیوں کہ انسان قوتِ فکر ہی کے ذریعے ان نشانیوں سے استدلال کر سکتا ہے جن سے آفاق و انفس بھرے پڑے ہیں اور قوتِ ارادہ ہی کی بدولت وہ خیر و سعادت کے کاموں کو پسند کرتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں انسان کی تمام صفات کی جامع ہیں اور نفس کی تمام حالتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا معلم اگرچہ معارف سے لوگوں کو آگاہ کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا لیکن نفس کی تربیت، تنویر، تزکیہ اور تطہیر میں وہ بہت سخت گیر ہوتا ہے۔ البتہ ہر شخص کا ذہن حکمت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے ایک شخص ڈاکٹر کے پاس جائے، اس کی دوا کھائے اور اسے شفا بھی حاصل ہو جائے، لیکن وہ بیماری کے دوبارہ حملے کی طرف سے بے خوف نہ ہو سکے۔ اس طرح کے لوگوں میں

ایسے بہت سے عابد و زاہد لوگ بھی ہوتے ہیں جو حکمت سے فائدہ اٹھا رہے ہوتے ہیں لیکن وہ خود حکیم نہیں ہوتے۔ البتہ جو آدمی غور و فکر اور عمل کی صلاحیتوں کو حاصل کر لیتا ہے اس کو حکمت مل جاتی ہے۔ غور و فکر سے یہاں ہماری مراد منطقیانہ غور و فکر نہیں بلکہ الہامی ادراک ہے۔ اس شخص کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے ایک چیز چکھی تو اس کے ذائقہ اور خوشبو کی خوبیاں اس پر روشن ہوگئیں، پھر اس نے اس سے لطف اٹھایا یا سیر ہوا۔ اب اس کی نظر اس چیز کی تاثیر سے خالی نہیں ہوسکتی اور نہ اس کا درخت اپنے پھل سے محروم ہوسکتا ہے۔

تمثیلات کے ذریعے تعلیم حکمت

حضرت مسیح علیہ السلام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حکمت کی تعلیم تمثیلات کے ذریعے دیتے تھے۔ جب لوگ ان کی بات نہ سمجھتے تو انہیں اس چیز کا بڑا ملال ہوتا۔ لوگوں کو جن باتوں کا محض گمان ہوتا اور وہ ان کی حقیقت کو نہ سمجھتے تو حضرت مسیح اس مسئلہ کے اشکالات ان کے سامنے رکھتے تاکہ وہ خود غور و فکر کی عادت ڈالیں۔ افلاطون کہا کرتا تھا کہ جو شخص تمثیلات کے ذریعے بات نہیں کرسکتا وہ حکیم نہیں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام امثال کے ذریعے تعلیم دیتے۔ قدیم حکماء یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ اپنے آپ کو پہچانو۔

قرآن مجید بھی تمثیلات کے ذریعے حقائق کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ امثال کا مقصد تذکیر ہے تاکہ لوگ اپنے نفس اور اس کے اندر موجود صلاحیتوں کی طرف رجوع کریں۔ قرآن نے امثال کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

وَ مَا یَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (العنکبوت:۴۳)

''ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔''

۲- قرآن کا زیادہ تر استدلال نشانیوں سے ہے اور اس نے واضح کیا ہے کہ یہ استدلال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فہم و تدبر سے کام لیں۔

۳- قرآن مجید کی امثال اور نشانیاں گونا گوں پہلوؤں سے پیش کی گئی ہیں اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ مسائل کو مختلف اطراف سے دکھانے کے لیے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید نے نشانیوں پر غور کرنے کے طریقہ کی طرف رہ نمائی بھی کر دی ہے۔[1]

۴- قرآن نے علم و عمل کو دو الگ چیزیں نہیں رہنے دیا بلکہ دونوں کو باہم ملا دیا ہے اور ان دونوں پر ایک ساتھ زور دیا ہے۔

۵- قرآن نے حکمت کے مقام، اس کے آنے کے دروازوں اور اسباب سب کی طرف رہ نمائی کی ہے۔

۶- نظم و ترتیب کو تفکر کا سب سے بڑا داعیہ اور غور کے مختلف پہلوؤں کا مرکزی نقطہ قرار دیا ہے۔

حکمت علم اور عمل کی جامع ہے

ایک حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ اس نے دوسروں کی تقلید کر کے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر حاصل کیا ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی فطرت کی آواز سنتا ہے کیوں کہ اس کی فطرت دوسری تمام چیزوں کی نسبت اس سے قریب تر ہوتی ہے۔ اس کے استدلال کی بنیاد ظن و تخمین پر نہیں ہوتی، نہ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ محض چند

---

(۱) یہ اشارہ ہے قرآن مجید کے معروف اسلوب ''تصریفِ آیات'' کی طرف۔ قرآن مجید کسی بات کو سمجھانے کے لیے کوئی ایک ہی پیرایہ استعمال نہیں کرتا بلکہ بات کو مختلف پہلوؤں سے کہتا ہے۔ نشانیوں کے بھی کسی ایک ہی پہلو کی طرف توجہ مبذول نہیں کراتا بلکہ ان کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لاتا ہے۔ تا کہ قاری پر اگر ایک جگہ بات واضح نہیں ہوئی تو دوسری جگہ اس پر واضح ہو جائے۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک غور کرنے کا طریقہ بھی یہی ہونا چاہیے کہ آدمی دلیل کے ہر پہلو پر توجہ دے۔ (مترجم)

اجزاء کو دیکھ کر ان سے عام کلیے اخذ کر لے۔ اس کے برعکس وہ اشیاء کے متعلقات و لوازم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا اخذ کردہ نتیجہ اس کی بصیرت ہی کا ایک پہلو بن جاتا ہے۔

حکیم اگر کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ بھی کسی دوسری چیز کے حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ وہ بلا واسطہ اسی چیز کی جستجو کرتا ہے جو اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ لذیذ چیز اور اس کی زندگی کا مقصود ہوتی ہے۔ علم و عمل میں جو لوگ پختہ کار ہوئے ہیں ان کا طرزِ عمل ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جو علم حاصل ہوا وہ ان کے سینے کی ٹھنڈک بن گیا اور جس مطلوب کو انہوں نے اختیار کر لیا تو اس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ ان دونوں دولتوں کو انہوں نے خوب خوب سمیٹا اور اس سے اطمینان پایا۔ ایسے ہی لوگ حقیقی عالم و عامل اور واقعی مخلص ہوتے ہیں۔ ان کا علم نہ تو محض برائے علم ہوتا اور نہ بارد یا مردہ ہوتا ہے۔ یہ علم سراپا زندگی، مجسّم قوت اور شوق و عمل کا جامع ہوتا ہے۔ پس ایک حکیم نفس اور اس کی بیماریوں، دنیا اور اس کی ناپاکیوں، تقویٰ اور اس کی لذتوں اور شفا بخشیوں سے واقف ہو جاتا اور اپنے رحیم، کریم اور حکیم خدا کو پہچان جاتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان لاتا، اس کی طرف مائل ہوتا اور اس کے جمال و کمال کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ غفلت کی تلخیوں کو بھی جان جاتا ہے اس لیے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیتا ہے۔ اس کا علم زندہ ایمان اور ایسا کامل یقین ہوتا ہے جیسے وہ غیب کا مشاہدہ یقین کی آنکھوں کے ساتھ کر رہا ہو۔ غیب کا یہ مشاہدہ اس مشاہدہ سے واضح تر ہوتا ہے جو وہ سر کی آنکھوں کے ساتھ کر سکتا ہے۔ ایک آدمی جب کسی خوب صورت حقیقت کو پا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کو محبوب نہ بنائے لہٰذا ایمان کے نتیجہ میں اللہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چناں چہ قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ:۱۶۵)

''جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔''

اس آیت میں حقیقی ایمان ہی کو حب کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جب جب خدا کو یاد کرتے ہیں وہ اس کی عظمت و کبریائی سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اس سے ان کے دل کانپ جاتے ہیں، خدا کی بزرگی اور اس کا جلال ان پر روشن ہو جاتا ہے؛ لہٰذا وہ اس کی طرف اڑ کر پہنچتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی رضا کے حوالے کر دیتے ہیں:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَاناً (الانفال:۲)

''مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں۔''

حکمت کی نشو ونما کی شرائط

حکمت دل کی زندگی ہے۔ زرخیز زمین کے اندر بیج ڈالا جائے تو وہ اُگتا ہے، اسی طرح دل زندہ کے اندر علم کا بیج نشو ونما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس دل میں علم کو زندگی ملے اور وہ نشو ونما پانے والے بیج کی طرح پھلنے پھولنے لگے تو یہ دل کی زرخیزی کی ایک دلیل ہے۔ علم کی زندگی کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس کو اپنے حال پر طاری کر لے اور اس کے نتیجہ میں عمل صالح اختیار کرے۔ رہی نشو ونما تو یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی صرف حرکت پیدا کرنے والی چیز ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں ایک خاص ترتیب اور نظام کا پایا جانا ضروری ہے۔ کوئی زندہ شے ایسی نہیں جس میں نظام نہ ہو، لہٰذا ایک منظّم علم کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا حسن اس کی رونق اور اس کا نفع ہوتا ہے۔ دل کی زندگی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر علم کی نشو ونما کی صلاحیت موجود ہو۔ گویا اصل معاملہ دل کی زندگی ہی کا ہے۔

حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کو عطا نہیں کی جاتی جو اس کو پانے کا

اہل نہ ہو۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ایک حکیم دوسروں تک اس کے پہنچانے میں بخل سے کام لیتا ہے بلکہ حقیقت میں وہ اس کے لیے غیرت رکھتا ہے اور غلط بخشی کے نتیجہ میں اس کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر بنجر زمین میں بیج ڈال دیا جائے تو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر علم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر یہ نفع نہ دے تو نقصان پہنچانے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اسی لیے ہادیِ برحق ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اللھم انی اعوذ بك من علم لا ینفع و قلب لا یخشع(۱)

''اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے اور اس دل سے جو عاجزی اختیار نہ کرے۔''

آں حضرتؐ کی یہ دعا اس عظیم حقیقت پر بھی دلیل ہے کہ اگر دل خشوع کی صفت سے خالی ہو تو آدمی کا علم اس کو کوئی نفع نہیں دیتا۔ یہیں سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کون سی چیز دل کو زندہ رکھتی اور اس میں حکمت کو قبول کرنے کی صلاحیت کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ اصل میں دل کا خشوع وہ دروازہ ہے جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہوتی ہے۔ یہ حکمت کو پانے کی شرطِ اول ہے اور اس کی تصریح قرآن مجید اور حدیث صحیح دونوں سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ خشوع حاصل کیسے ہوتا ہے اور حکمت کے حصول کے لیے دل کو کیسے تیار کیا جاتا ہے۔

ایک غور کرنے والا شخص جب آسمان، زمین اور انفس میں خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور رحمت کا مشاہدہ کرتا ہے، پھر اپنے نفس کو دیکھتا ہے کہ وہ انتہائی بلندی اور انتہائی پستی کے درمیان رکھ دیا گیا ہے تو یہ چیز اس کے اندر خدا کی خشیت اور امید ساتھ ساتھ پیدا کرتی ہے۔ پھر اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اس کا پیدا کرنے والا عادل اور ایک پاکیزہ رب ہے۔ اس کے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل

بالمقابل وہ خود غلط کار، بھٹکنے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر اس قدر خشیت پیدا کرتا ہے کہ وہ خلوت و جلوت میں حدودِ الٰہی کی پابندی کرنے لگتا ہے۔ وہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ خشیت اور تقویٰ کی ان صفات سے اس کا قلب صاف ہوتا اور حکمت کے نور کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کتاب الامثال میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ حقیقت بیان فرمائی کہ حکمت کا سرا رب کی خشیت ہے۔

اسی خشیت اور تقویٰ کے نتیجہ میں بندہ خشوع اور فروتنی کا لباس اوڑھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ساری بادشاہی تنہا اس کے منعم رب کی ہے اور وہ اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ رب سے دور ہونے سے ڈرتا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے۔ وہ اسی سے طالب مدد ہوتا اور اسی کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ اس خشوع کے نتیجہ میں آدمی کے اندر علم کی تعظیم اور اس کے بارے میں حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے اور اعتراض کرنے کی روش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز حکمت کی نشو ونما کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہے اور یہ خشوع رفع درجات کا ذریعہ بنتا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَ إِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلة:۱۱)

''اور جب کہا جائے کہ (مجلس سے) اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ اللہ ان لوگوں کے جو تم میں سے اہل ایمان ہیں اور جن کو علم عطا ہوا ہے، مدارج بلند کرے گا۔''

اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ اس آیت میں بھی ہے:

فاسلكی سبل ربك ذللا (النحل:٦٩)

''پھر اپنے پروردگار کے ہموار رستوں پر چل۔''

حکمت بالتدریج حاصل ہوتی ہے

حکمت کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ یک بارگی یہ کبھی حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ مختلف مواقع پر آہستہ آہستہ اور درجہ درجہ حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح مکان یک بارگی تعمیر نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اسی طرح کا معاملہ حصولِ حکمت کی راہ پر پیش آتا ہے۔ غذا کو بڑی مقدار میں ایک ہی دفعہ معدے میں ڈالنے کی کوشش کی جائے تو معدہ اس کو قبول نہیں کرتا اور وہ ضائع جاتی ہے۔ اسی طرح قلب کے اندر بھی حکمت کو ایک ہی مرتبہ میں اٹھا لینے کی طاقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو یکبارگی نہیں اتارا گیا۔ اس کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے:

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (الفرقان:۳۲)

''تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔''

حکمت کی تعلیم دینے والا بھی اسی طریقہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ مختصر کلام کرتا ہے تاکہ شاگرد اس پر جلدی سے نہ گزر جائے بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے مزید شرح و تفصیل کا خواہش مند، استاد کا محتاج اور اس کے ساتھ طویل صحبت کا طالب ہو۔

اسی حقیقت کے فہم سے میری راہ نمائی قرآن مجید کے نظم کی حکمت کی طرف ہوئی ہے۔ قرآن نے اپنی تعلیم کے لیے کئی طریقے اختیار کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہر ہر آیت کو ایک مستقل تعلیم کا حامل بنایا ہے۔ جب آدمی ایک تنہا آیت کو محلِ تدبر بناتا ہے تو اس کو اسی پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہوئی جیسے کارخانوں کے کارکنوں کے لیے ایک مخصوص شعبہ ہی میں مشغولیت کافی سمجھی جاتی ہے۔ اگر کارخانے کا پورا نظام ان پر کھول دیا جائے تو وہ

ششدر رہ جائیں اور ان کے لیے وہ کام کرنا بھی مشکل ہو جائے جس کے کرنے کی وہ اہلیت رکھتے ہیں۔ کامل نظام ہمیشہ اس شخص پر کھولا جاتا ہے جو اس کو سمجھنے کا اہل ہوتا ہے۔ کارخانے کے کارکن کی طرح فوج کا ایک سپاہی اپنے مورچے پر ڈیوٹی کے لیے کافی ہوتا ہے اور وہ اس سے ہٹ کر اس سے زائد کسی چیز کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا۔ لڑائی کا پورا نقشہ صرف کمانڈر کے پاس ہوتا ہے اور وہی اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر بہت سے لوگوں نے قرآن سے معمولی واقفیت پر قناعت کر لی اور اس کے اجزا کے باہمی ربط کو جاننے کی کوشش کی۔ لیکن جو شخص حکمت کی کسی وادی کا آشنا ہو جاتا ہے وہ قرآن کے مجموعی نظم کی طرف رہ نمائی پاتا ہے۔ اس کی نظر میں مجموعۂ آیات کی خوبیاں، بلند حقائق علمیہ، علومِ الٰہیہ کے مختلف شعبوں کا نقطۂ جامعہ اور کتاب اللہ سے حاصل ہونے والی شفائے کلی، ہر چیز سما جاتی ہے۔

مسلمانوں کے اولوالامر کے لیے نظمِ قرآن سے واقف ہونا ضروری ہے

اوپر کی بحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات جس شخص کے حوالے کیے گئے ہوں، اس کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ کتاب اللہ کے نظم سے بے خبر رہے کیوں کہ اس کے لیے اصل رہنما قرآن ہی ہوسکتا ہے۔ اگر اس کا حال یہ ہے کہ وہ قراان کے متفرق امور ہی سے واقفیت رکھتا ہو اور صفات کے مدارج اور نظام سے بے بہرہ ہو تو ایسا لیڈر افراط وتفریط کے درمیان ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اس کا اجتہاد جانب داری پر مبنی اور حق سے دور کرنے والا ہوگا۔ آپ ان بڑے لوگوں کی سیرت پڑھیے جنھوں نے خلافت کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہی ایسے فتنے پیدا کر دیے کہ ارکان اسلام ہی ان سے خطرے میں پڑ گئے تو صاف نظر آتا ہے کہ دین کے معاملے میں ان کی شدت اور ان کا زہد وتقشّف اس کا باعث ہوا، حالاں کہ ان کے اندر دین کی نصرت کا جذبہ اور اس کے لیے مطلوب شجاعت اور جرأت بھی

موجود تھی۔ مجموعی طور پر ان لوگوں کے اعمال کے پلڑے ہلکے رہ گئے اور اس کا سبب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے اعمال کو عقل سے خالی رکھا، فرع کو اصل اور سنت کو فرض کا درجہ دیا اور جس چیز کی حیثیت دُم کی تھی اس کو سر کی حیثیت دے دی۔ اگر یہ لوگ حکمت سے بہرہ ور ہوتے اور کتاب اللہ میں پائی جانے والی ہدایت کو اس کی واقعی اہمیت دیتے تو لوگ اس کی طرف بھاگ کر جاتے۔

ظواہر شریعت اور ان کے اصول وحقائق کے مابین وہی تعلق ہے جو عوام اور ان کے خواص وعلماء کے مابین ہے۔ جس طرح عوام اپنے خواص پر غالب نظر آتے ہیں اسی طرح ظواہر شریعت دین کی روح پر غالب نظر آتے ہیں۔ اس بات کو ہادی علیہ السلام نے اچھی طرح واضح فرمایا۔ آپ نے خوارج کے معاملہ میں اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کیا ہے(۱) ملت کا نظام خراب اس وقت ہوتا ہے جب اشرار کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ ان کے حملے عوام پر ظاہری امور میں تو جاری رہتے ہیں اور یہ ان کی

---

(۱) مصنف علیہ الرحمۃ کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مال بعض سرداروں میں تقسیم فرما رہے تھے۔ آپ کا مقصد ان کی تالیف قلب کر کے ان کو اسلام کا حامی بنانا تھا، اس پر ایک شخص نے آگے بڑھ کر آپ کو ٹوکا اور کہا کہ آپ عدل سے کام لیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آسمانوں و زمین کے رب نے میرے اوپر اعتماد کیا ہے اور وہ صبح وشام وحی کی امانت میرے حوالہ کرتا ہے، میں عدل نہیں کروں گا، تو اور کون کرے گا؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ یا حضرت خالد بن ولیدؓ اٹھے اور اس معترض شخص کی گردن مارنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے منع کر دیا اور فرمایا کہ اس قماش کے لوگوں کی ظاہری نمازیں ایسی ہیں کہ تمہاری نمازیں ان کے آگے شرما جائیں۔ یہ قرآن مجید کی شاندار قراءت کرتے ہیں لیکن وہ ان کے گلے سے اوپر اوپر ہی رہتا ہے۔ یہ لوگ ظاہری نیکی کے باوجود دین سے نکل جانے والے ہیں۔ یہ حدیث مختلف واسطوں سے صحیح مسلم کی کتاب الزکوٰۃ میں باب ذکر الخوارج وصفاتھم میں آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ظواہرِ شریعت میں تو بے حد انہماک ظاہر کرتے ہیں لیکن اصولِ دین سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ حضورؐ پر اعتراض کرنے والے شخص نے یہ نہیں سمجھا کہ رسولؐ پر ایمان لانے کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کی ظاہری نیکی اس کو دین کی حقیقت سے آگاہ کرنے میں ناکام رہی۔ (مترجم)

بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بعد میں ان کو ان لوگوں کی تائید بھی حاصل ہو جاتی ہے جن کی عقلیں کوتاہ لیکن کام کرنے میں وہ بہت تیز ہوتے ہیں۔ اس طرح اشرار غلبہ پا کر ملت کی تنظیم کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔

اوپر ہم نے دین دار لیکن جاہل لوگوں کے غلبہ کے نتائج بیان کیے تھے اور اب اشرار کے غلبہ کی مضرت واضح کی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس صاحب امر نے فرع کو اصل کی جگہ دے دی اور پست کو بلند کا درجہ دیا اس نے ملت کے نظام کو منتشر کر دیا۔ اس سے نظم قرآن کو سمجھنے کا فائدہ اور اس سے بے خبری کا نقصان واضح ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کی اصلاح (اور اس کے ساتھ دوسری امتوں کی اصلاح) اسی حکمت سے ہوگی، جس کی طرف قرآن رہ نمائی دیتا ہے۔ اس حکمت تک پہنچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے شاندار نظم کے اندر کیا کیا معارف رکھ دیے ہیں۔ جو شخص نظم کا لحاظ رکھے بغیر حکمت قرآن کو جاننا چاہے گا وہ کتاب اللہ کے فہم میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا اور اپنی تدابیر میں گم راہی میں پڑ جائے گا۔

حصہ دوم

باب ۶:

دینِ اسلام کا نظام

حکمت کی تعمیر اس اساس پر ہوتی ہے کہ ہستی کے مختلف اجزا کے درمیان موافقت کی نوعیت معلوم ہو۔ یہ علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کائنات کے نظام کو نہ سمجھا جائے اور یہ نظام اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ حقیقت روشن ہوجائے کہ اس کے تمام اجزا ایک ہی نظام کے اجزا ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ چیزوں میں جب بھی موافقت کے پہلو تلاش کیے جائیں تو اس موافقت کی خصوصیت سامنے رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ مثلاً آپ زید کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوتے ہیں لیکن آپ کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ عمرو کا باپ بھی ہے۔ گویا کسی بھی نظام رکھنے والی چیز میں ہمہ دانی ممکن نہیں۔ یہ حقیقت بھی جانی پہچانی ہے کہ آپ ایک جملہ کے ہر جزو کا موقع و محل اور تمام اجزا کی نسبت جانے بغیر جملہ کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔ محض الفاظ کے معنی جاننا فہم کلام میں اس وقت تک مفید نہیں ہوتا جب تک کہ پورا جملہ سمجھ میں نہ آئے، بلکہ جب تک آدمی جملہ کے صحیح معنی کو اخذ نہ کرے، اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی تک بھی اس کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ٹھیک اسی طرح اس حکیم کو بھی مشکل پیش آتی ہے جو پوری کائنات کے نظام اور اس کے اندر موجود وحدت پر غور کر رہا ہوتا ہے۔

نظامِ کائنات کی وحدت

کائنات میں صرف ایک ہی نظام اور ایک ہی مسلسل نعمت کا ظہور ہے۔ اس

میں جو تضاد نظر آتا ہے یا تو وہ خیر ہی کو برآمد کرنے کے لیے ہے یا وہ جوڑوں جوڑوں میں موافقت کے نہ سمجھنے کے باعث ہے جس کے نتیجہ میں کائنات کے اندر پائے جانے والے فساد اور شر کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھ لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اضداد کا حوالہ بہت زیادہ دیا ہے لیکن ان کے جوڑے ملا کر بتایا ہے کہ ان اضداد سے کس طرح خیر کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک حکیم جب اضداد پر غور کرتا ہے تو وہ بھی ان کی منفعت اور ان میں خیر کے پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس معاملہ میں قدماء کا طریقہ بھی یہی تھا اور ان کے بعد ہر زمانے کے حکما بھی اسی طرح غور کرتے رہے۔ حافظ نے کہا ہے ع

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش
کہ من ایں مسئلہ بے چون و چرا می بینم

کائنات کا خالق کامل ہستی ہے

کائنات میں جس ہستی کا وجود لازم ہے وہ صفت کمال رکھتی ہے۔ جب محض وجود نہ چھپا رہ سکتا اور نہ بیکار رہ سکتا ہے تو پھر کامل ہستی کیسے معطل و مخفی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا اس کا تقاضا ہوا کہ ایجاد کرے۔ ایجاد وہاں ہوتی ہے جہاں پہلے کچھ نہ ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حرکت کے تصور کے لیے پہلے سکون کا تصور ضروری ہے۔ پس قدیم ذات نے عدم کو وجود کا، سکون کو حرکت کا، تاریکی کو روشنی کا، کمزوری کو قوت کا، پستی کو بلندی کا اور جبر کو اختیار کا جامہ پہنایا۔ اس نے تخلیق کیا، اشیاء کو نمودار کیا، خلق پر شفقت اور کرم کیا، اس کو علم اور عزت دی۔ اس نے انسان کے اندر علم اور جہالت، محبت اور بغض، سخاوت اور بخل کی متضاد صفات کا امتزاج رکھا، جس کے باعث اس کو کوشش، محنت اور مشققت اور ترقی اور نشو ونما کا وسیع میدان میسر آ گیا۔ پس ناقص کے لیے کمال، کمزور کے لیے قوت، جہالت کے مقابلہ میں علم اور شک کے مقابلہ میں یقین کا حصول مقصود قرار پایا۔ لیکن اولین ہستی میں آخری ہستی بھی ہے اور باقی سب کو اسی کی

طرف لوٹنا ہے۔ اس بات کو یوں فرمایا:

وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (آل عمران:۲۸)

''اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔''

وَ لِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (آل عمران:۱۸)

''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت۔''

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے پہلے تھا، باقی سب اس کی مخلوق ہے، یہ سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان سب کا رخ اسی کی جانب ہے اور وہی ان کا مقصود ہے۔

کامل وجود کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم، باقی رہنے والا، ازلی اور ابدی ہو، اس کی قوت اور پاکیزگی کمال کو پہنچی ہو، لہٰذا اس نے جو کچھ چاہا وہ خیر ہے، جو کچھ واقع ہوا وہ خوب صورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر جس طرح ہستی اس پر ختم ہوتی ہے اسی طرح خیر و خوبی بھی اس پر ختم ہے، اگر یہ بات نہ مانی جائے تو اس کے وجود کا کمال مجروح ہوتا ہے۔ پس:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الحدید:۳)

''وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

نظامِ دین کی حکمت کی ضرورت

اس بنیاد پر اب دین کے معاملہ پر نگاہ ڈالیے۔ دین اگر صحیح ہو تو لازماً اس کا نظام بھی صحیح ہونا چاہیے۔ نظام کے صحیح ہونے سے مراد یہ ہے کہ دین کے عقائد اور اعمال کے درمیان، دین اور فطرتِ انسانی کے درمیان، اور دین اور کائنات کے درمیان کامل

موافقت ہو۔ جب یہ سب موافقتیں صحیح ہوں گی تو ایسا دین پُر حکمت، فطری اور سیدھا سادا ہوگا جو رحیم و حکیم رب کی راہ دکھائے گا۔ اور جو شخص اس کی حکمت سے واقف ہو کر اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا، وہ نورِ بصیرت پر ہوگا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عالم کی ایک ایسے عبادت گزار پر فضیلت کیوں بتائی گئی ہے جس کی ظاہری عبادت میں کوئی خلل یا نقص نہیں ہوتا۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں ہے کہ عابد فرائض وسنن اور اوامر ونواہی کے جاننے میں عالم کا محتاج ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسے علم کے بغیر تو عبادت کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر عابد ظاہری احکام کا عالم تو ہوتا ہی ہے۔ اگر وہ عالم نہیں ہوتا تو دین کی حقیقتوں کا عالم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اپنے رب کی عبادت اسی طرح کرتا ہے جس طرح ایک بت پرست، ایک مجوسی، ایک یہودی یا ایک نصرانی کرتا ہے۔ اس کے تمام معاملات بدگمانی اور بدحالی کے ساتھ ہوتے ہیں، اس کے اخلاق و اعمال کمزور رہوتے ہیں، وہ اللہ سے اس چیز کی آرزو کرتا ہے جس کے پورا کرنے سے اللہ شرماتا ہے، وہ اس سے ایسا گمان رکھتا ہے جو کسی مہذب اور شریف آدمی کو بھی پسند نہیں چہ جائے کہ رب سبحانہ وتعالیٰ سے وہ گمان کیے جائیں۔ یہاں ان بدگمانیوں کی تفصیل ممکن نہیں۔ بس یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ دین کی حکمت جاننے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی ایک بے خبر آدمی گمان کرسکتا ہے۔

اپنے اس مقالہ میں ہم دین اسلام کی ہیئت کلی پر روشنی ڈالیں گے، خارج سے اس کی نسبت کو بیان کریں گے اور اس کے داخلی اجزا کی باہمی نسبتوں اور ان کی تقدیم وتاخیر کے مواقع کی وضاحت کریں گے تاکہ ان کے اجزا کا باہمی ربط اور خارج کے ساتھ ان کی موافقت معلوم ہو۔ اور ہم یہ جان سکیں کہ حق کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں:

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ○ (الملک:۳)

''تم خدائے رحمٰن کی صنعت مین کوئی خلل نہیں پاؤ گے، نگاہ دوڑاؤ، کیا تمہیں کوئی نقص نظر آتا ہے۔''

پس ہم قرآن اور فطرتِ انسانی کے درمیان توافق، خلق اور امر کے درمیان توافق اور رب عزیز و حکیم اور انسان، جس کو اس نے بہترین ساخت عطا فرمائی ہے، کے درمیان تعلق کو واضح کریں گے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر انسان اور تمام مخلوقات کے درمیان تعلق معلوم ہوگا، جیسا کہ قدیم فلاسفہ نے کہا ہے کہ انسان عالم اکبر ہے۔ لیکن ہم یہ توافق اپنی تاویل کے مطابق بتائیں گے، جس میں ارادہ کرنے والے اور اس کے ارادہ کے درمیان، فعل اور اس کے مقصد کے درمیان، مفعول اور اس کے ذریعہ کے درمیان، ذات اور اس کی صفات کے درمیان، اور جو چیز طاقت میں ہوتی ہے اور جو عملاً ظاہر ہوتی ہے اس کے درمیان موافقت واضح ہوگی، کیوں کہ انسان کا موقف دو حالتوں کے درمیان رہتا ہے۔ البتہ ان موافقتوں کے اجزا کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آدمی کو ان کی باہمی نسبت معلوم نہ ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نظام کی پہچان سے تعبیر کیا ہے۔

ہدایت و ضلالت

قرآن نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حقیقی دین صرف اسلام ہے اور یہی اصل فطرت ہے۔ اسی طرح اس نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ قرآن اصل ہدایت ہے۔ یہی رب کی راہ دکھاتا ہے اور دین فطرت کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ اس طرح اس نے قرآن اور انسان کے درمیان موافقت اور خلق اور امر کے درمیان موافقت کو واضح کیا ہے، چناں چہ ارشاد فرمایا:

اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○ (طٰہٰ:۵۰)

''اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی۔ پھر اس کی رہ نمائی کی۔''

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○ (الاعلیٰ:۲،۳)

''جس نے خاکہ بنایا۔ پھر نوک پلک سنوارے، جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی۔''

آیت میں لفظ 'سوّیٰ' آیا ہے۔تسویہ یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کے تمام اجزا کو ایک دوسرے کے لیے موزوں اور مناسب اور ایک مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنایا جائے تا کہ اس کے بعد ان کے استعمال سے اس مقصد کو پورا کیا جا سکے۔خلقت کو خوب بنانے اور محکم کرنے کا مفہوم بھی یہی ہے جیسا کہ ان آیات میں ہے:

اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدۃ:۷)

''اس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے!''

اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ط (النمل:۸۸)

''اس نے ہر چیز کو محکم کیا۔''

آیات کے یہ مفہوم نہایت واضح ہیں۔اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جس ذات نے پیدا کیا اسی نے ہدایت کا سامان بھی کیا اور جب وہ ہدایت دیتا ہے تو وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو۔لہٰذا فرمایا:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف:۵۴)

''آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔''

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی ہدایت انسان کی اس ساخت اور فطرت کے موافق ہے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے تو وہ اللہ کی ہدایت ہے اور اس کے راستہ اور ارادہ کی نشان دہی کرتی ہے۔مزید اس نے ہمارے نفوس کے اندر اس کی پہچان بھی رکھ دی ہے کیوں کہ مذکورہ بالا آیت میں 'ھدیٰ' کے معنی یہ ہیں کہ خالق نے جس طرح

ہر شے کو کسی نہ کسی نفع اور استعمال کے لیے پیدا کیا اسی طرح اس نے جن مقاصد کے لیے وہ شے بنائی ان کے حصول کے لیے اس کی رہ نمائی بھی عطا کی۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انسان کو ہر شے کی تفصیل کا علم بھی ہو۔ اس کے لیے اولاً اتنی بات کافی ہے کہ وہ ان مناسبتوں کو جانتا ہو جو اس کے اور اس شے کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ وہ ان کو جمع کر کے ایک لڑی میں پرولے۔ ثانیاً تفصیل سے اتنا آگاہ ہو جتنا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کے لیے وہ اس کا محتاج ہے۔ اس طرح وہ کائنات کی دوسری تمام اشیاء کی طرح اس ذات کے ارادہ کے مطابق چل سکے گا، جس کی گرفت میں ساری کائنات کی باگ ہے:

وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (یٰسٓ:۴۰)

''ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے۔''

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل:۸۴)

''کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے گا۔''

اگر انسان اس علم کے خلاف چلے تو وہ اپنی فطرت کی مخالفت کرتا اور اپنے خالق کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ البتہ وہ خالق کے بنائے ہوئے مضبوط نظام سے باہر نہیں نکل سکتا اور نہ اس کے امر پر غلبہ پاسکتا ہے۔ کیوں کہ خالق نے جس طرح ہر مخلوق کے لیے ایک اندازہ ٹھیرایا ہے اسی طرح اس نے انتظام بھی ٹھیرا رکھا ہے۔ اس نے انسان کو اختیار دیا تو خیر اور شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت تو دے دی لیکن خیر و شر سے کسی ایک پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا لیکن چوں کہ اس نے انسان کو صاحب اختیار بنایا تھا، اب اگر وہ اس کو کسی بات پر مجبور کرتا تو وہ خود اپنے پُرحکمت اور پُرشفقت ارادہ کے خلاف کرتا اور انسان کو جو آزادی عطا کی تھی اور اپنا قرب اس کو عنایت کرنے کے لیے اس کی آزمائش کا جو نظام بنایا تھا وہ خود اس کو توڑ

دیتا۔ اس کے برعکس اگر انسان خود ہی اپنی فطرت کی نافرمانی کرتا اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹتا ہے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوتا ہے جو اس نے اپنے نفس کے لیے خود اختیار کیا۔ البتہ اس طرح خالق کا ارادہ پورا ہو جاتا ہے۔

ہدایت وضلالت کا یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کے لیے مزلّہ قدم ثابت ہوا ہے اور مذاہب پر اس کے اثرات نہایت گہرے پڑے ہیں۔ اس پر نہایت تفصیل سے کلام کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے لیے یہ مناسب موقع نہیں۔ یہاں اس سے صرف اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ ایک حکیم کے لیے کائنات اور اپنے نفس کی معرفت ضروری ہے تاکہ وہ اس نظامِ کلی کو جان سکے جس کے تحت دین کا نظام آتا ہے۔

ابتلاء کی حکمت

انسان کی ابتلاء آرام و آسائش اور تکلیف دونوں کے ذریعے ہوتی ہے یعنی اس کا شکر بھی جانچا جاتا ہے اور صبر بھی۔ شکر کی صورت میں وہ خلق کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ اسی لیے ناشکری کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَ لَا تَحَاضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر:۱۷-۲۰)

''ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے، اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے کو ابھارتے، اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو۔ اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔''

صبر کی صورت میں انسان کو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی طرف خیر کو واپس لانے والا رب تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کی اپنی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ اس کو بدلہ عطا فرمائے۔ اس حقیقت کو یوں فرمایا:

اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

(البقرۃ:۱۵۶)

''جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر:۱۰)

''جو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے ان کو ان کا صلہ بے حساب پورا کیا جائے گا۔''

پس صبر ترقی کا زینہ ہے اور شکر اخلاص، عبادت گزاری، دعا اور عاجزی کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ جب ایک بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کا رب نہایت رحیم و کریم ہے تو وہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو جاتا اور اس کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث کرتا ہے، وہ اس کی طرف سکون پاتا ہے، دوسرے بندوں کے لیے شفقت کے جذبات رکھتا ہے اور یہ سب اطاعت کے جذبہ سے کرتا ہے تاکہ اپنے رب کو راضی کر لے۔ صبر و شکر کی دو بنیادی صفات میں جس قدر غور کیا جائے یہ حقیقتیں اسی قدر کھلتی جاتی ہیں۔

مقصدِ حیات و کمالِ سعادت

نفس انسانی کی جدوجہد کی غایت دو چیزیں ہیں: ایک ان قوتوں اور صلاحیتوں میں کمال حاصل کرنا ہے جو اس کو ودیعت کی گئی ہیں، دوسری اس مقصد کو پانا جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

جو چیزیں ودیعت کی گئی ہیں اور ان کی تکمیل مقصود ہے، وہ علم و عمل کی دو قوتوں اور فہم و اخلاق کی نشو و نما دینا ہے۔ علم اور فہم کا کمال یہ ہے کہ آدمی نور و ظلمت، حق و باطل اور ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے لگے اور عمل و اخلاق کا کمال یہ ہے کہ وہ

اپنے مادی جسم کی گھٹیا چاہتوں سے بلند ہوکر اپنی روح کی اعلی پسند کو اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کو ہدایت وضلالت میں فرق کرنے کی صلاحیت دی ہے جیسا کہ اس کو نیکی کے کام کرتے اور گھٹیا فانی چیزوں پر اعلیٰ اور پائدار چیزوں کو ترجیح دینے کے اسباب سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتیں عطا کیں۔ پھر اس کی طرف روشنی اتاری اور رسول بھیجے جب کہ اس کو اتنی صلاحیت دے رکھی تھی کہ جو چیز اس کے آگے رکھی جائے وہ اس کو پہچان سکے۔ اگر وہ نفس کی فطرت کے مطابق اس کو اسباب فراہم نہ کرتا تو انسان اس پیغام کے قبول کرنے کا مکلّف نہ ہوتا جو اس کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو مقصود مقرر کیا ہے وہ اپنے رب کی اطاعت اور خواہ ناگواری کے ساتھ ہی ہو، اس کے فیصلہ پر راضی رہنا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے رب کے تقرب کے لیے اپنے وجود کے تقاضوں سے بھی دست بردار ہو جائے تو اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اگر چہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات اس کی عبادت کرتی ہے لیکن انسان جب عبادت کرتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی ساخت کے مخالف بات ہوتی ہے اس لیے اس کو یہ جدوجہد اور محنت نہایت کامل اور بڑی ہوتی ہے۔ اس کی حالت یہ ہوتی ہے جیسے وہ اپنے رب کی امانت کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسی راہ پر چل رہا ہو، جس میں چوروں، درندوں، رکاوٹوں اور پھسلن سے گھرا ہوا ہو بلکہ اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنے وجود کی مخالفت کے باوجود اپنے رب کی طرف چل پڑا ہو، وہ خود اپنے نفس کا دشمن ہو جائے، اس کے ساتھ کشمکش کرے اور اس پر غالب آجائے تو اس کو قتل کر کے اپنے مولیٰ کے آگے ڈال دے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ (الاحزاب:۷۲)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔''

کی تاویل روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی طبیعت کا یہ گھٹیا پہلو ہی ہے جو اصل میں اس کے تقرب کا موجب ہوا ہے۔ کوئی مجاہد اس وقت تک مجاہد نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی ایسا دشمن نہ ہو جس پر وہ غلبہ پانے کی جدوجہد کرے۔ کوئی مقرب بندہ اس وقت تک مقرب نہیں کہلاتا جب تک وہ قربانی کو ذبح نہ کرے۔ یہاں قربان کی جانے والی چیز نفس اور اس کی خواہش ہوتی ہے۔ پس کسی دوسری مخلوق کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جو انسان کو حاصل ہوسکتا ہے اور نہ کسی کی وہ عزت ہوسکتی ہے جو اس کی عزت ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے اپنی طرف عروج کے لیے ایک زینہ مقرر فرما دیا اور اس کو فہم اور اختیار کی آزادی کی جو خصوصیات عطا فرمائی تھی ان میں اس کی ابتلا رکھ دی۔

اسلام میں تزکیہ اصل مقصود ہے

مذکورہ بالا تمام امور بالکل واضح ہیں۔ ہم نے ان کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے نظام اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے تعلق کی طرف توجہ دلائیں تاکہ قارئین کو اللہ کے دین میں حکمت کے مقام کا علم ہوسکے اور جو آیات اس نظام کی وضاحت میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں، ان کے موقع ومحل کی وضاحت ہوسکے۔ انہی میں سے وہ آیت ہے جو نبی ﷺ کی صفات کے بارے میں قرآن مجید میں کئی مقامات پر آئی ہے:

يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

(آل عمران:۱۶۴)

''جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

نبی ﷺ کی یہ چار صفات قرآن مجید میں چار مواقع پر آئی ہیں۔ پہلی مرتبہ ان کا ذکر سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں ہے جو انہوں نے نبی ﷺ کی بعثت اور آپ کی امت کے بارے میں کی تھی۔ اس دعا میں تزکیہ کا ذکر باقی صفات کے بعد ہوا ہے، جب کہ دوسرے تین مواقع پر تزکیہ کو تلاوت آیات کے بعد اور تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ ان تینوں مواقع پر بغیر کسی فرق کے اسی ترتیب کا لحاظ ہے۔ جو شخص اس فرق پر غور کرے گا اس پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ تزکیہ اصل مقصود ہے، جس کو پانے کے لیے کئی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں اس کو مؤخر کر دیا ہے۔ رہا دوسری آیات میں اس کو تعلیم کتاب و حکمت پر مقدم رکھنا، تو یہ حضور ﷺ کی اصل ذمہ داری کو نمایاں کرنے کے لیے ہے۔

خلق وامر کے نظام میں موافقت کے پہلو

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ موافقت پیدا کرنا یا تو کسی خاص مقصد کے حصول اور کسی متعین مدت کے لیے ہوتا ہے یا دائمی ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی موافقت خلق اور امر کے دائرہ میں ہوتی ہے کیوں کہ تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کا خاص نظام بھی بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح ایک ریل کی تصویریں یکے بعد دیگرے سامنے آتی ہیں، اسی طرح ہر خلق کے ہمراہ اس کا نظام نظر آتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا امر بھی برابر حرکت میں رہتا ہے۔ دوسری قسم کی دائمی موافقت علم، ارادۂ عمومی اور آخرت کے انجام کے دائرہ میں نظر آتی ہے۔ ارادۂ عمومی اور آخرت کا انجام دونوں علم کے ساتھ ہیں۔ ایک حکیم کے علم میں باہم کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس کو حکمت کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے ارادہ اور غایت میں بھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ

ارادہ غایت کے تابع ہوتا ہے اور غایت ایک ہی ہے جو آیت کُلٌّ اِلَیْنَا رَاجِعُوْنَ (سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں) سے ظاہر ہے۔ پس علم کے نظام میں باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جو باطل ہم خلق میں دیکھتے ہیں وہ بھی زمانہ کے لحاظ سے تو حق ہوتا ہے لیکن چوں کہ اس نے رخصت ہو جانا ہوتا ہے اس لیے اس کو باطل کہتے ہیں:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ
وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ۝ (الانبیاء:۱۸)

''بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمہارے لیے اس چیز کے سبب سے، جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے۔''

یعنی تم لوگوں کی بدگمانی کے برعکس ہمارے ارادہ میں باطل کو دخل ہے اور نہ ہماری تدبیر میں اس کو راہ مل سکتی ہے۔

جب حکمت کا طالب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ خلق اور امر میں حق کے پہلو کو دیکھ سکتا ہے اور وہ اپنے علم کے سورج کی روشنی میں خلق و امر پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو متاعِ گم گشتہ مل جاتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس پر مطمئن ہو جاتا ہے، اس کو اپنے علم اور معلومات کے درمیان اور اپنے ارادہ کے نظام اور اس کے خارج کے درمیان پوری مطابقت نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ کائنات اور اس کے خالق پر قناعت کر لیتا ہے۔ ارادہ کے نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی اس کو خوب صورت اور شاداب پاتا ہو، اس میں اس کو وہ منزل نظر آتی ہو جس تک پہنچنے کا وہ متمنی ہو۔ یہ سب کچھ صرف اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کی فطرت پاک اور اعتدال پر ہو، جس طرح کہ اس کی تخلیق احسنِ تقویم پر ہوئی ہے۔

فلاسفہ کے علم کی نارسائی

ہمارا علم محدود ہے اور ہم بہت کم جانتے ہیں۔ لیکن ایسے علم کا شر جو اصل حقیقت کے خلاف ہو بے حد سنگین ہوتا ہے۔ اصل میں یہ علم کی صورت میں جہل ہوتا ہے، بالکل اس طرح جیسے بھیڑیے نے میمنے کی کھال اوڑھ لی ہو۔ ارسطو نے جب یہ فلسفہ پیش کیا کہ حکمت تمام علوم کا احاطہ کر لینے کا نام ہے تو وہ غلطی پر تھا۔ چوں کہ ایسا احاطہ اسے عملاً ناممکن نظر آیا اس لیے اس نے حکمت کو کلیات کے علم کے قالب میں ڈھال لیا اور اس کے لیے ایک نظام وضع کیا۔ بعد والوں نے کچھ دوسری ترتیبیں بھی تجویز کیں۔ کسی علم کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لیے مختلف ترتیبیں تجویز کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں جو خرابی تھی وہ یہ تھی کہ یہ سارا کچھ محض مفروضہ تھا جس میں حکمت نام کو نہ تھی۔ ارسطو نے اس خرابی کو بھانپ لیا تھا۔ چناں چہ اس نے مابعد الطبیعیات (Metapnysics) کو اعلیٰ حکمت قرار دیا۔ اس کے باوجود وہ ابتدائی وہم میں سے نکل نہیں سکا اور اس نے امور عامہ کو حکمت کا موضوع قرار دے دیا۔ اس طرح وہ حکمت تک رسائی کے معاملہ میں حجاب ہی میں رہا۔ اس پر یہ مقولہ صادق آ گیا کہ علم خود سب سے بڑا حجاب ہے۔ اپنے طور پر وہ علم میں مشغول رہا لیکن علم اور عالم دونوں اس سے غائب ہو گئے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا باعث بنا۔

ارسطو کے بعد دوسرے فلاسفہ نے علم اور عالم کو موضوع فکر بنایا لیکن وہ اوہام میں اُلجھ کر رہ گئے اور علم کے سرچشمہ تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ شک و انکار کے تاریک بیابانوں میں سرگرداں پھرتے رہے۔ سچ ہے:

وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡراً فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ۝ (النور:۴۰)

''اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔''

جہالت تاریکی کی مانند ہوتی ہے۔ جس طرح بعض لوگوں کو اندھیرے میں بھوتوں کے دانت نظر آتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگ اگر کسی معاملے کی حقیقت تک نہ پہنچ سکیں تو ان کے اندر فاسد خیالات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ شک کے طوفان میں گھر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر ان کے علم نے جڑ نہیں پکڑی ہوتی، ان کو یقین کی ٹھنڈک نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ایک حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے، اس کی بدولت بہت سے امور سے اس کی بے خبری اس کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ نور پر تاریکی کبھی غالب نہیں آسکتی۔ چوں کہ یہ بات اس کے علم میں ہوتی ہے کہ کسی غیر متعلق معاملے سے اس کی بے خبری اس کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بن سکتی، لہٰذا وہ اس بے خبری کا اقرار کرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ بکثرت باتوں میں یہ کہہ دیتا ہے کہ میں ان کو نہیں جانتا۔ اصل میں وہ اپنے علم کے محکم حصار کے اندر ہوتا ہے۔ وہ حکمت کی محکمات کے علم سے اطمینان حاصل کرتا ہے اور تقدیر کے معاملات جیسی متشابہات کے علم کو تقدیر بنانے والے کے سپرد کر دیتا ہے۔

انسان کے اختیارات کی حکمت

کائنات میں رحمت کا جاری ہونا کسی مجبوری کے باعث نہیں ہے۔ اگر اس کا سبب مجبوری ہوتی تو اس کو رحمت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ تخلیق کرے۔ پھر رحمت کی تکمیل کے لیے اس نے نعمت کی تکمیل کی۔ رحمت کی تکمیل ہی کی خاطر یہ ضروری ہوا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو اس بات کی اہلیت رکھتی ہو کہ اس پر نعمت تمام کی جائے۔ اتمامِ نعمت کی شکل یہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مقام سے بھی بلند تر مقام رکھنے والی مخلوق پیدا کر دیتا کیوں کہ وہ تو خود ہر چیز سے بالاتر ہے۔ لہٰذا اس نے ایسی مخلوق بنائی جو اس کے قریب ہو سکے اور اس کے اوصاف کو اختیار کر سکے۔ یہ اوصاف اس سے مشابہت کے طور پر نہیں بلکہ اس کے ساتھ موافقت کے

لیے ہوں، بالکل اسی طرح جیسے حسن کے لیے عشق اور نور کے لیے بصارت موافق صفات ہیں۔ اس موافقت کو سمجھنے میں فلاسفہ اور ان کے ماننے والوں نے غلطی کی اور یہ گمان کرلیا کہ انسان کی تخلیق رحمٰن کی صورت پر ہوئی ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ معبود سے مشابہت اختیار کرلے۔

انسان پر نعمت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اختیار اور اعلیٰ مراتب کے لیے رغبت کی صفات رکھیں۔ یہیں سے اس کے اندر شر، کج روی اور خواہشاتِ نفسانی کو در آنے کی راہ ملی۔ اس اختیار کا مقصود اصلی یہ تھا کہ خدا کے شکر اور اس کی طرف انابت کے فضائل آدمی کو حاصل ہوں اور وہ عفو و مغفرت کی خوبیوں کو جان سکے تاکہ وہ رب کریم کی نظر عنایت، اس کی رافت، عفو اور اس کی رضا کے پانے کا اہل ہو سکے۔ رحمت کی انتہا رب کی طرف سے درگزر اور وسیع مغفرت ہے۔ اگر اختیار نہ ہوتا تو نعمت کی تکمیل نہ ہوتی اور اگر بندے گناہ نہ کرتے تو رحمت کی وسعت میں کسر رہ جاتی۔ لہٰذا انسان کو جو اختیار ملا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے اس کو اعلیٰ مراتب کے حاصل کرنے کا اہل بنایا ہے۔ یہ رب کی رحمت کا مظہر اتم ہے۔ بندہ اپنے اختیار سے خدا سے منہ موڑتا ہے۔ پھر جب وہ اس اعراض کا کڑوا مزا چکھ لیتا ہے تو اسی اختیار سے وہ رب کی طرف لازماً متوجہ بھی ہوتا ہے۔ تب وہ اس سے اس کی رحمت اور معافی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں خدا کی رحمت بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے کیوں کہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

باب ۷:

مذاہب پر غور کا طریقہ

مذاہب میں عبادت کا تصور

تمام امتوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ دین نام ہے رب کی بندگی اور اطاعت کا۔ ان کے درمیان جس باب میں اختلاف ہوا، وہ اسی حقیقت کی تفصیل میں اس وقت ہوا جب لوگوں نے اس میں اپنے ظن اور اپنی خواہشات کو شامل کرلیا۔ لہٰذا سب سے زیادہ اہمیت عبادت یا بندگی کی حقیقت کے صحیح فہم کو حاصل ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ چار چیزیں اس میں شامل ہوں:

(الف) رب کریم کے لیے اخلاص: یہ اخلاص توحید پر ایمان کے ساتھ مطلوب ہے اور اس امر کی وضاحت قرآن مجید میں بکثرت ہوئی ہے۔ عبادت کے درست ہونے کا بڑا انحصار اسی پر ہے اور عملی وعلمی کج روی جو عبادت میں بگاڑ پیدا کرتی ہے اس کی نفی بھی اخلاص سے ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات بہت طولانی ہیں، جن کو ہم قاری کے فہم پر چھوڑتے ہیں۔ ان کو قرآن کی تصریحات کے مطالعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(ب) مغز عبادت کی معرفت: عبادت کا مغز رب کی طرف رجوع، اس کی پسند کو خوشی کے ساتھ اختیار کرنا، اس کے آگے عاجزی کرنا، اس کے سامنے اپنی

حاجتیں بیان کرنا اور اس سے اچھی توقعات وابستہ کرنا ہے۔ یہ ساری باتیں دو عبادتوں: نماز اور قربانی میں جمع ہوگئی ہیں۔ اسی لیے کوئی بھی صحیح دین نماز اور قربانی کی عبادات سے کبھی خالی نہیں رہا۔ یہ لازم ہے کہ نماز اور قربانی اخلاص اور عاجزی کے ساتھ ہوں۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کی تو ظاہری شکل ہی عاجزی کی تصویر ہے۔ رہی قربانی تو اس کے پیش کرنے والے پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے۔ لہٰذا اگر اس کی عبادت خدا کے آگے انتہائی عاجزی اور محتاجی کے انداز میں پیش نہ ہوگی اور اس میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ شامل نہ ہوگا تو خدا اس کی قربانی کو حقارت سے ٹھکرا دے گا۔ اس بات کی وضاحت قرآن مجید نے ایک سے زیادہ آیات میں کر دی ہے۔

(ج) اللہ کی رضا کے رستہ پر چلنا: یہ جن صفات پر مشتمل ہے ان کو ہم تقویٰ اور اعمالِ خیر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یعنی وہ اعمال جن کی ہدایت فطرتِ انسانی میں ہے یا جن کی تعلیم رب نے دی ہے۔ انہی سے بندے کی اس سعی کا اظہار ہوتا ہے جو وہ ایک کام کے کرنے اور دوسرے کو چھوڑنے میں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ کو پانے کی جستجو اور اس کی رضا کے مطابق رویہ اختیار کرنے کی کوشش اسی قبیل سے ہیں۔

جس شخص کے اندر اخلاص، نماز اور زکوٰۃ درست ہو جائیں تو لازم ہے کہ اس کے تمام اعمال درست ہو جائیں گے۔ ان تینوں میں غایت درجہ باہمی موافقت اور ایک ترتیب نظر آتی اور انہی کی بدولت دین کے اجزا کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ ان کے بعد جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ اجزائے دین کی صورتِ ترکیب ہے جس پر ان کی حقیقت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

(د) اجزائے دین کی ترکیب: کسی بھی شے کی تکمیل اس کے نظام اور اس کی ترکیب سے ہوتی ہے۔ یہی اس کا کمال اور اس کی خوب صورتی کی انتہا ہوتی ہے۔ یہ چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس شے کے تمام اجزا موجود ہوں۔ لہٰذا یہ

ضروری ہے کہ بندہ اپنے اندر سب سے پہلے اخلاص کو، جو رب تعالیٰ پر ایمان سے حاصل ہوتا ہے، پھر دعاؤں اور نذروں کے ذریعے اس کی طرف رجوع اور انابت کو اور پھر تمام اعمال میں اللہ کی رضا کی طلب کو اس طرح جمع کرے کہ وہ اپنے نفس اور اس کی خواہشات کی غلامی سے چھوٹ کر اپنے دین کو اپنے رب ہی کے لیے خالص کر لے۔ اس کے بعد یہ ضروری ہوتا ہے کہ بندہ میانہ روی کی روش کا خیال رکھتے ہوئے ان میں کمال حاصل کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی ایک جانب سے غفلت کر کے دوسری جانب جھک جائے۔ یہ کمال اسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو عالم بھی ہو اور اجزائے دین کی ایک دوسرے کے ساتھ نسبتوں سے بھی واقف ہو، پھر وہ اپنے ارادے پر اس قدر مضبوط گرفت رکھتا ہو کہ اس کا ارادہ اور اس کی پسند اس کے علم کے مطابق ہو جائے اور اس سے اس کے وجود کو ایسا اطمینان حاصل ہوتا ہو جس کے بعد اس کی عقل اور قلب کے درمیان، اس کے علم اور عمل کے درمیان، اس کے ظاہر اور باطن کے درمیان اور اس کی خواہش اور اس کے مولا کے درمیان کوئی مغائرت باقی نہ رہ جائے۔ جب کسی بندے کی عبادت میں پہلی تین خصوصیات کے ساتھ اجزاء کی ترکیب کی یہ چوتھی خصوصیت شامل ہو جاتی ہے تو اس کی عبودیت کامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک حکیم مردِ مومن بن جاتا ہے۔ اس کا دین مضبوط اور اس کی راہ سیدھی ہو جاتی ہے، جس میں کوئی کجی نہیں ہوتی۔

مذاہب میں گمراہی کے داخل ہونے کے اسباب:

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی گمراہی کا سبب نفس اور رب کے پہچاننے میں ان کی غلطی ہے۔ انہوں نے ایک صحیح بنیاد پر پوری نگاہ نہیں ڈالی اور دوسری صحیح بنیاد سے اغماض برت لیا، کیوں کہ وہ ان مختلف بنیادوں کے مابین موافقت نہیں کر پائے۔ ہندومت، بدھ مت، مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت جیسے عام مذاہب میں گمراہی شاید ان کے غلو، بدعات اور خواہشاتِ نفس کی راہ سے داخل ہوئی ہے۔

جہاں تک ہندومت کا تعلق ہے، اس کے ماننے والوں نے توحید کے معاملے میں غلو سے کام لیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وجودِ ذات کو ہم قدیم سے تعبیر کریں یا 'میں' سے، یہ ایک ہی بات ہے۔ اس گمان کے نتیجہ میں ان کا دعویٰ یہ ہو گیا کہ "اہم برہم"، یعنی 'میں اللہ ہوں۔' اس حقیقت تک رسائی کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ دنیا کو تیاگ دیا جائے اور ذات کو فنا کیا جائے۔ انہوں نے اپنی ہمت کے مرکز کو حقیقت کی صورت دے لی۔ یہی 'میں' کی حقیقت ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یقین کر لیا کہ اس حقیقت کو پانے کے محکم قواعد موجود ہیں۔ جو شخص ان پر عمل کرنے کی مشقت اٹھائے گا، وہ مراد کو پا لے گا۔ رب کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ رب تو خود آدمی کی اپنی ذات ہے۔ چناں چہ ان لوگوں نے نہایت مشکل مجاہدوں کا طریقہ اختیار کیا اور نفس کے انوار اور اس کی قوت کی بدولت وہ دھوکے میں پڑ گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندومت میں یہ جو کچھ ہوا یہ ان کے رشیوں کے غلو کے سبب سے ہوا۔ کیوں کہ ان میں بعض ایسے ہندو بھی ہیں جو ایک قدیم معبود، جو ہر چیز کا خالق اور انسان کو ہدایت عطا فرمانے والا ہے، پر یقین رکھتے رہے ہیں۔ بعد کے ادوار میں ہندو چھ فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کے عوام پر بت پرستی غالب آ گئی۔

ہمارے اندر صوفیہ کی گم راہی ہندوؤں کی گم راہی کے عین مطابق ہے۔ البتہ یہ ہوا کہ ان کے اندر بعض صوفیہ نے کتاب وسنت کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ ان سے رہ نمائی حاصل کرنے پر زور دیتے رہے اور غیبی انوار سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہوئے۔ انہوں نے یہی سبق دیا کہ اللہ تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء یعنی ہر چیز سے آگے اور آگے ہی آگے ہے۔

ایک حکیم کا مذاہب پر غور کرنے کا طریقہ

ایک حکیم کسی مذہب پر غور کرتا ہے تو اس کے پیشِ نظر تین چیزیں ہوتی ہیں:

اوّلاً: **مذہب کا وجود اور اس کا نظام:** اس میں حکیم مذہب کے اجزاء اور مقصود کے ساتھ اس کے تعلق کو دیکھتا ہے اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان اجزاء میں اس مقصود کو حاصل کرنے کی صلاحیت کس قدر ہے۔ پھر وہ اس مذہب کے اندر حق اور بدعات پر نگاہ ڈالتا اور ان میں امتیاز کرتا ہے۔ یہ بات اس کے لیے اس بنا پر ممکن ہوتی ہے کہ وہ خود حق کا حامل ہوتا ہے اور وہ کسوٹی اس کے پاس ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اصل اور فرع کے درمیان امتیاز کر سکے۔

ثانیاً: **دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کی نسبت:** اس پہلو سے ایک حکیم یہ دیکھتا ہے کہ مختلف مذاہب میں کس قدر مشابہت ہے۔ ایک نے دوسرے کا کتنا حصہ جذب کیا ہوا ہے اور اصل اور فرع کے لحاظ سے ان میں کیا تعلق ہے۔

ثالثاً **ثابت شدہ حقائق کے ساتھ اس کی نسبت۔** ایسے حقائق میں فطرتِ انسانی اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ شامل ہے۔

تحقیق میں حکیم کی بنائے استدلال

ہر مذہب میں کسی نہ کسی کتاب، نقل یا علمی ورثہ کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ اس کے ماننے والے اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور اس کے احکام کو مانتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا ہے کہ اس مذہبی کتاب یا علم میں تبدیلی یا تحریک ہو چکی ہے۔ لیکن ایک حکیم پر اس تبدیلی یا تحریف کے باعث مذہب کا معاملہ گڑبڑ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذاہب فطرتِ انسانی پر مبنی ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان کے ابتدائی صحیفوں کا باہمی اختلاف بہت کم ہے۔ وہ ان میں موافقت تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا سبب اس کی اپنی عادت اور حق کی خصوصیت ہوتی ہے۔ حکیم کے اندر جانچ اور حق کی جستجو کا مادہ ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ محض منسوب کردہ تعلیمات اور باطل علم میں سے بھی سچی بات کو الگ کر لیتا ہے۔ وہ خزف ریزوں میں سے جواہر کو نکال لیتا ہے۔ اس

عمل میں اس کا انحصار دو بنیادوں پر ہوتا ہے: ایک یہ کہ حق میں ایک طرح کی نورانیت اور فطرت میں ایک بصیرت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں ایسی موافقت ہوتی ہے جیسے فطرت حق ہی کا آئینہ ہو۔ دوسری یہ کہ کسی معاملے میں شہادتوں کا پے درپے جمع ہونا بہت بڑی بات ہے، جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ پس جب کسی معاملے میں فطرت کی تمام حسیات کی شہادت موجود ہو، اللہ تعالیٰ نے جو وحی اتاری ہے، وہ معاملہ اس سے موافقت رکھتا ہو اور سلف کی عقلیں اس پر متفق رہی ہوں تو اس بارے میں کسی شک کا احتمال نہیں رہ جاتا۔

باب ۸:

دینِ اسلام کی بنیادیں

اللہ تعالیٰ کی معرفت

یاد رہے کہ ایمان باللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی تین صفاتِ کمال: رحمت، قدرت، اور حکمت پر ایمان لانا ہے۔ ان تینوں صفات کے دائرہ میں دوسری تمام صفاتِ جلال وصفاتِ جمال داخل ہیں۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ کا قدیم ہونا، اس کا ہمیشہ باقی رہنا، اس کا زندہ جاوید ہونا، اس کا علم، سخاوت، خلاقی، بادشاہی، بے نیازی، عزت، حلم، تدبیر، اس کا ہدایت دینا، دعا سننا، خلق پر نظرِ عنایت کرنا، فضل کرنا، معاف کرنا، مظلوم کا انتقام لینا، حق و عدل کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس کے علاوہ وہ تمام صفات جن کی طرف اسمائے حسنیٰ رہنمائی کرتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان تین صفاتِ کمال پر ایمان لے آتا ہے اس کو ایمان باللہ کے باقی ارکان کی ہدایت بھی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ:

وَ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ (التغابن:۱۱)

''اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کی رہنمائی کرتا ہے۔''

اس مضمون کو دیگر کئی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

جو شخص رب کو ان کامل صفات کے ذریعے پہچان لیتا ہے تو اس کے اندر لازمی طور پر شکر اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی نعمتوں میں

گھرا ہوا پاتا ہے۔ اگر وہ خدا کا شکر ادا نہ کرے تو یہ اس کی اکڑ اور حق تلفی کی دلیل ہے اور اگر خدا کو سب سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے تو ایسا شخص شکر کا حق ادا نہیں کرتا۔ مزید برآں یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس شخص کے اندر فطرتِ انسانی کے احساسات کا شعور کامل نہیں۔ فطرتِ انسانی جلال و جمال کو محبوب رکھتی ہے۔ اگر فطرت کا یہ پہلو معدوم ہو جائے تو انسان چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ اثر اس کی فطرت کے اخلاقی پہلو کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ باقی رہا اس کا علمی پہلو تو ہم مختصر طور پر اس کو بھی واضح کرتے ہیں۔

رب تعالیٰ کو اس کی صفات کمال کے ساتھ پہچاننے کی کوشش کرنا انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ جس طرح حقائق کے ادراک کے نتیجہ میں طبیعت کے اندر تمام معارف ابھر آتے ہیں اسی طرح کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے نتیجہ میں انسان رب کو پہچاننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں اس مسئلہ کو ثابت کرنے کا موقع نہیں، بلکہ مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ قرآن مجید کے نصوص کی رو سے دین کا نظام کیا ہے۔ اس بارے میں قرآن نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ رب تعالیٰ پر ایمان انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ آگے ایسے مباحث آئیں گے جو اس مسئلہ کو واضح کر دیں گے۔ یہاں میں ایک معترض کی طرح خود ہی یہ سوال کرتا ہوں کہ میں نے خلق کی جانب سے صرف شکر ہی کو کیوں واحد جذبہ قرار دے لیا ہے۔ حالاں کہ انسان کے نفس میں دوسرے بھی کئی جذبے ہیں مثلاً ایک عظیم اور قاہر رب کے لیے اس کے اندر خوف اور ایک صانع اور ماہر رب کے لیے حیرت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ چناں چہ عام مذہبی گروہوں کے مذہب کی بنیاد خوف پر اور اکثر فلاسفہ کے مذہب کا مدار حیرت و استعجاب پر ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ باری تعالیٰ کے مظاہر میں انھی دو قسموں کے مظاہر کی کثرت ہے اور یہ انسان سے قریب تر اور اس کے لیے واضح تر بھی ہیں۔ اسی لیے انسان معمولی غور و فکر کے بعد ان پر متنبہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ (الزخرف:۹)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز وعلیم نے پیدا کیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ رب کی اس پہچان کا سبب یہی ہے کہ کائنات میں اس کی عظمت اور صناعی کے نشان نہایت واضح ہیں۔

باری تعالیٰ کی پہچان کے لیے صرف اس کی صفاتِ قدرت وصنعت پر انحصار کیا جائے تو یہ شرف کی نفی تو کر دیتی اور مزید غور وفکر پر ابھارتی ہیں، لیکن آدمی جب تک صفاتِ ربوبیت و رحمت کا ادراک نہیں کرتا وہ دین تک نہیں پہنچ پاتا۔ کیوں کہ یہ وہ صفات ہیں جو غایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور صفاتِ حکمت وقدرت انھی کی خاطر ہیں۔ جب آدمی کا غور وفکر اس کو یہاں تک لے آتا ہے تو وہ ربوبیت کی معرفت حاصل کر لیتا اور یہ جان لیتا ہے کہ باری تعالیٰ ہی رحمٰن و رحیم ہستی ہے۔ اس وقت اس کو رب کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے، وہ اس کا شکر ادا کرتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے۔ اس حقیقت پر قرآن سے کئی شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی صفات پر ایمان اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آخرت پر بھی ایمان لایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کے اندر خدا کے پیغام کے لیے پیاس موجود ہے۔ وہ اس کی ملاقات کا مشتاق ہے، اس کے ذکر سے وہ سکون پاتا ہے، وہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور اس کے ہاں سے کوئی خبر لائے۔ یہ تمام کام اس جذبہ محبت ہی کے مظاہر ہیں جو شکر سے پیدا ہوتا ہے۔

ایمان کے ثمرات

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ پہلا کام رب تعالیٰ کی ان نشانیوں پر غور کرنا ہے

جنہوں نے آفاق و انفس کو بھر رکھا ہے اور جو صفاتِ جلال و جمال کے کامل ہونے کی دلیل ہیں۔ دوسرا کام جو پہلے ہی کا نتیجہ ہے وہ خدا کے لیے شکر و محبت کے جذبات کا پیدا کرنا ہے۔ اسی سے بندہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا، اس کے آگے عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا اور اس سے امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہی ایمان کے ثمرات ہیں۔ اس سے نفس کی آلودگی دور ہوتی ہے اور بندہ تزکیہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی ہے کہ دل کی بعض مشغولیتیں شکر و محبت کا جذبہ پیدا ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان کے سبب سے بندہ نادر صورتوں کے سوا کسی ایسے شخص کا محتاج ہوتا ہے جو اس کو خبردار کرے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے آباء و اجداد، قوم اور قبیلہ کے زیر اثر نشو و نما اور تربیت پاتا ہے۔ وہ ان سے جو کچھ سنتا ہے وہی بات اس پر غلبہ پا لیتی ہے۔ اس فوری جذبہ کی خواہشات اور ذاتی مشغولیت کے زیر اثر وہ عام طور پر خیالات اور اخلاق میں انہی کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ بہت نادر ہوتے ہیں جو اللہ کی آیات میں غور و فکر کرنے پر از خود متنبہ ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء اور حنیف لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے متنبہ ہونے کے بعد جن لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں وہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت مغلوب نہیں ہوئی ہوتی۔ وہ حق کی طرف بلانے والے کی پکار کا جواب دیتے ہیں جو کبھی تو فوراً ہوتا ہے اور کبھی اس میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس کا انحصار آدمی کے غور کرنے کی استعداد اور اس کے حسن اخلاق پر ہوتا ہے۔ انسان کو فطرت میں جو بھی صلاحیتیں حاصل ہیں ان میں ہم اسی چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی کے باعث وہ فنون کا عالم اور ماہر بنتا اور حسنِ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی میں استعداد نہ ہو تو وہ سیکھ ہی نہیں سکتا۔ گویا پہلی تعلیم سن کر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد غور و فکر سے آتی ہے۔ اس سے اگلے مرحلہ میں اُس ہدایت کے قبول کرنے سے آتی ہے، جس پر انسان کی فطرت پیدا کی گئی ہے۔ ادراک کی قوت ہو یا قوت ارادی، دونوں کی فطرت حقیقت میں حق اور خیر ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ تمام قوتیں

جس طرح استعمال کی جاسکتی ہیں اور اس سے وہ اصلاح پاتی اور ترقی کرتی ہیں اسی طرح یہ بے کار چھوڑی جاسکتی ہیں، ان کو بگاڑا جاسکتا ہے اور یہ فنا بھی ہوسکتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ دین اسلام انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اب آیئے اس دین کے نظام کو سمجھیں۔

دین کے نظام کی بنیادیں

دین کے نظام کی اولین بنیاد عدل ہے۔ یہ عقل اور اخلاق کا نقطہ امتزاج ہے۔ حسن اخلاق کا مطمح نظر احسان ہے۔ اسی کا ایک پہلو اُن حقوق کا ادا کرنا ہے جو کسی شخص پر واجب ہوں۔ یہ شکر ہے، لہٰذا شکر عدل میں داخل ہے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے کہ اس کے رب کے جو احسان اس پر ہیں، ان کا حق اس پر واجب ہے تو اس شخص کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ شکر کی ادائیگی کو واجب قرار دینا عدل کا تقاضا ہے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے کہ آپ تمام نعمتیں تو بلا معاوضہ حاصل کریں اور ان کے جس حق کی ذمہ داری آپ پر ہے اس کو ادا نہ کرنا چاہیں۔ چناں چہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

> إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (النحل:۹۰)

> ”بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور ذوی القربیٰ کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔“

یہ آیت اس حقیقت کی شاہد ہے کہ نظام کی اولین بنیاد عدل ہے۔ اس کے تحت شکر کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ اگر عقل کی جانب سے ہو تو اس کی بصیرت اور اگر

قلب کی جانب سے ہو تو اس کی حیرت کی دلیل ہے۔ نعمت کا انکار کرنے والا دھوکہ میں مبتلا، حق تلفی کرنے والا، کم ظرف، کمینہ، کم فہم اور بے حیا ہوتا ہے۔ وہ ایک فیاض کے دسترخوان سے کھاتا ہے، لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنی احتیاج میں اس نے کہاں سے کھانے کو پایا۔ اس کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ منعم کے احسان کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ایسا شخص حماقت اور بے شرمی دونوں عیوب کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ:

وَ يَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد:۱۲)

''اور وہ اس طرح کھا رہے ہیں جس طرح چوپایے کھاتے ہیں۔ دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔''

ایسے لوگ حرص اور پیٹ کے غلام ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ادراک کے لحاظ سے بندے کا اولین کام اپنے منعم کو پہچاننا اور عمل کے لحاظ سے اس کا پہلا کام شکر ادا کرنا ہے۔ جب وہ شکر کا حق ادا کر لیتا ہے تو اپنے عمل سے عدل کی شہادت دینے والا بن جاتا ہے۔ اگر وہ شکر ادا نہیں کرتا تو وہ ظلم ڈھانے والا اور عدل کا مخالف بن جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بکثرت مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بندہ اپنی شکر گزاری سے اگر نفع پہنچاتا یا ناشکری کر کے اگر نقصان کرتا ہے تو اپنی ذات ہی کا نقصان کرتا ہے۔ اس کا رب ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔

شکر کی حقیقت

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شکر اصل ایمان اور اولین عبادت ہے اور یہ اللہ کے خالق اور منعم ہونے کا تقاضا ہے، ہم شکر کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

جس طرح عدل اپنی ذات کے اعتبار سے ایک لازمی صفت ہے اسی طرح شکر بھی ایک لازمی صفت ہے۔ یہ عدل ہی کا ایک جزو اور اسی کا اظہار ہے، اس لیے

بالبداہت ضروری ہے۔ شکر کا مفہوم امکان کی حد تک، اور اگر کوتاہی ہو تو اس کے اعتراف کے ساتھ، احسان کا بدلہ چکانا ہے۔ جس پر انعام ہوا ہو وہ کوتاہی کے الزام سے تو کبھی بچ نہیں سکتا، کیوں کہ جس نے انعام کیا اس کو پہل کرنے کی فضیلت تو حاصل ہو ہی گئی۔ جب معاملہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہو تو کوتاہی کے پہلو لاتعداد ہوتے ہیں۔ شکر، جیسا کہ معلوم ہے، احسان کے مساوی بدلہ کا نام ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر جو انعام فرمایا ہے وہ کسی ذاتی ضرورت کے تحت نہیں فرمایا ہے بلکہ محض رحمت و شفقت کے سبب سے فرمایا ہے اور خداوند تعالیٰ کے انعامات اس کی رحمت کے نشان ہیں۔ اس لیے اس رحمت و شفقت کے مشابہ اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ ایک ایسی کامل محبت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی جو ہمارے امکان کی حد تک اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو۔ اس کے علاوہ اللہ کی ذات کو اپنی مخلوق پر جو فضیلت حاصل ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں۔ لہٰذا جو شخص اپنی انتہائی وسعت کے مطابق اللہ سے محبت نہیں کرتا وہ خدا کا شکر ادا کرنے والا نہیں ہے۔ اسی لیے تورات، انجیل اور قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ سے کامل محبت رکھنا لازم ہے۔ یہ چیز محبت کی وحدت کا تقاضا بھی کرتی ہے جیسا کہ تورات اور انجیل میں واضح کیا گیا ہے اور قرآن نے تو نہایت کامل طریقہ سے اس مضمون کو کھولا ہے۔

چوں کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا عدل ہی کا تقاضا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے ہمسر مان کر شرک کا ارتکاب ایک ظلم عظیم ٹھہرا، جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے۔ نیز چوں کہ شرک میں ایک قابل احترام نفس کو اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکا کر ذلیل کیا جاتا ہے اس لیے شرک کو رِجس (ناپاک) قرار دیا گیا۔ اسی سبب سے تورات میں بتوں کو رِجس کہا گیا ہے اور شرک کو چھنالے سے تشبیہ دی گئی ہے تاکہ یہود پر نفس کی توہین کا پہلو بھی واضح ہو اور خدا کو اس سے جو نفرت ہے اس کو وہ بیوی کے لیے شوہر کی غیرت کے حوالہ سے سمجھ سکیں۔

کسی کے بارے میں اگر یہ علم ہو جائے کہ وہ آپ سے محبت رکھتا ہے، اس نے آپ کو برگزیدہ کر لیا ہے اور اپنی کسی غرض کے بغیر آپ پر انعام کر رہا ہے تو یہ چیز آپ کے اندر اس کے لیے محبت پیدا کر دے گی۔ پھر جس قدر آپ اس کی نعمتوں کو یاد کریں گے اسی قدر اس کے لیے آپ کی محبت میں اضافہ ہوگا لہٰذا پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ آپ اس حقیقت کو پہچانیں کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن، رحیم، پالنے والا، مہربان، محبت کرنے والا، قدردان، بے نیاز، ستودہ صفات، درگزر فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد شعوری طور پر پاکیزہ فطرت کے ساتھ ہم اس کا شکر کرنے والے بنیں تو یہی حکمت کی راہ کا پہلا قدم ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

(لقمان:۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا اپنے ہی لیے رہے گا۔ اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔''

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اس کی صفات کے ساتھ پہچان لیا اور اس پر ایمان لایا، لازم ہے کہ اس کے اندر خدا کی محبت کا شدید جذبہ بھی پیدا ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ:۱۶۵)

''جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔''

جب کسی سے محبت ہو جائے تو آدمی اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ محبت

میں لذت اور کشش ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ایک آدمی کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف کشش محسوس کرتا اور اس میں محو ہوتا ہے۔ اس کو اس کی یاد سے آرام ملتا ہے۔ وہ اس کی نشانیوں سے مانوس ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کو محبوب کی یاد دلائے اور اس کے قریب ہونے کی راہیں بتائے۔ وہ اس چیز سے جان چھڑاتا ہے جو محبوب سے اوجھل کرنے کا باعث بن رہی ہو اور اس شخص کے طریقے کی پیروی کرتا ہے، جو اس سے قرب پانے میں کامیاب ہو چکا ہو۔ اسی لیے فرمایا:

قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ۝ (آلِ عمران:۳۱)

''کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

کتنا عظیم الشان ہے یہ وعدہ! اس سے بلند تر مرتبہ کون سا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنا محبوب بنالے اور ان کے گناہوں کو معاف فرما دے۔ جو شخص اس مرتبہ کو پانے کا خواہش مند ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے غفور و رحیم ہے۔ بلکہ وہ تو ان لوگوں پر زیادہ شفقت فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ اس حقیقت کو نہ صرف قرآن نے بلکہ انجیل نے بھی واضح کیا ہے۔

عدل کی اہمیت

اوپر کی بحث سے دین میں عدل کا یہ مقام واضح ہوا کہ توحید اور عدل دونوں کی اصل ایک ہے۔ اگر توحید اسلام کا سرا ہے تو عدل (اور اس کے ساتھ شکر) اس کی اساس ہے۔ دیکھئے یہ حقیقت قرآن مجید کی آیت سے کس طرح روشن ہو رہی ہے، فرمایا:

شَهِدَ ٱللَّهُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ وَأُوْلُواْ ٱلۡعِلۡمِ

قَآئِمَاً بِالْقِسْطِ لَا إِلٰـهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ O (آل عمران ۱۸)

''اللہ، فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

ہم جس طرح اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت میں منفرد ہے اسی طرح ہمارا ایمان اس پر بھی ہے کہ وہ عدل کے مطابق کام کرتا ہے لہٰذا اس کے احکام اور افعال میں ظلم یا بے انصافی کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ الوہیت کی عزت اور تقدس کے اس کے سوا کوئی معنی ہی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ عادل اور قسط کو پسند کرنے والا ہے۔ یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ الوہیت کے مفہوم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ اس نے اپنے اندر رحمت کو سمو رکھا ہے۔ پس رب کا قرب حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ مذکورہ دو صفتوں یعنی عدل اور احسان کو اختیار کر کے اپنے مولیٰ کے ساتھ موافقت پیدا کی جائے۔ شکر ان دونوں صفات کا جامع ہے۔ ہماری نماز اللہ کا شکر اور عدل ہے۔ اسی طرح ہماری زکوٰۃ بھی اس کا شکر اور عدل ہے اور یہ اس کے انعام کا شکر ہے۔

شکر کا تقاضا - ہدایت کی طلب

ہمارے اس بیان سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ پہلا کام، جس سے عدل کا ثبوت ملتا ہے، شکر ہے۔ جب بندے کے اندر شکر پیدا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ اور اس پر غور کرتا ہے۔ وہ اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ اس کا ایک ہی رب ہے، جس کے اندر جمال و جلال کی صفتیں پورے کمال کے ساتھ جمع ہیں۔ یہ چیز اس کے اندر محبت، سکینت، مرعوبیت اور نیاز مندی پیدا کرتی ہے۔ اس سے اس کا وہ عقدہ حل ہوتا ہے جو اس کے دل میں کسی برے کام پر ضمیر کی ملامت کی صورت میں پیدا ہوتا تھا۔ وہ اس ملامت کو محسوس کرتا اور اس کے نقطہ آغاز کی

جستجو کرتا ہے۔ رب رحیم کے لیے اس کی عاجزی سے ضمیر کے اندر اس احساسِ ذمہ داری کے نقطہ آغاز کا اس کو سراغ مل جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر حیا، خوف، امید، رضائے الٰہی اور تمام ایسے اخلاق اپنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس کو رب کا قرب عطا کردیں۔ اس طرح وہ ایک مومن، مسلم اور موحد بن جاتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کو تنبہ اس کی فطرت کی جانب سے ہوا یا دل کی روشنی سے ہوا یا وحی الٰہی سننے سے ہوا۔ یا اس کو بصیرت اور یقین سے متمتع کرنے کا باعث کوئی ایسا شخص بنا جس نے ان چیزوں کی طرف اس کو دعوت دی۔

یہ ایمان جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے، ایمان کی ابجد اور اس کا ایک مجمل خاکہ ہے۔ اس میں روزِ جزا اور رب کی رحمت وعفو پر ایمان شامل ہے، خدا کی محبت اور اس کی رضا طلبی اس کی ایک شاخ ہے، جلیل و برتر آقا سے ڈرنا اس کا ایک جزو ہے، اس میں ایسے اچھے اعمال کا عزم از خود شامل ہے جن کا رب قدوس کی نگاہوں میں خوب صورت اور پسندیدہ ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہو۔ اس کے بعد جب بندہ کسی ایسے شخص کی بات سنتا ہے جو اس ایمان کی تفصیلات سے اس کو آگاہ کرے تو اس کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اس کی پیروی پر کمر کس لیتا ہے۔ اس وقت اس کی حالت یوں ہوتی ہے جیسے وہ اپنی متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں تھا اور اس نے اس کو پالیا۔ یا جیسے وہ راہ گم کردہ تھا، رستے کی تلاش میں سرگرداں تھا اور کسی پکارنے والے نے اس کو راستہ بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری لے رکھی ہے کہ وہ بنی آدم کی طرف ہادی اور داعی انہی کے اندر سے بھیجتا رہے گا۔ اس نے بندوں سے صرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان کی ہدایت کو قبول کریں۔ یہ حکم اس نے اس وقت دیا جب انسان کو زمین پر سکونت کے لیے بھیجا جیسا کہ فرمایا ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّى هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

کی رضا کا طالب ہونا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس پر خدا کا غصہ بھڑکے گا۔ جب بندہ غور کرتا ہوا یہاں تک پہنچتا ہے تو اس کی زبان سے وہ دعا نکلتی ہے جو سبحنك فقنا عذاب النار سے آگے و توفنا مع الابرار تک ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے اہل عقل قرار دیا ہے۔ یہی لوگ ہیں کہ جب وہ کسی منادی کو ایمان کی طرف بلاتے ہوئے سنتے ہیں تو اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ان کو ان کے ربِ غفور کی راہ اور نیکوں کی رفاقت کی دعوت دے رہا ہے۔ ان کا یہ نتیجہ اخذ کر لینا ہی ان کے عقل مند ہونے کی روشن دلیل ہے۔

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے

قرآن اور سنت دونوں نے اس بات کی تصریح کر دی ہے اور عقل پر بھی یہ بات واضح ہے کہ عمل نہ کرنے والے کے لیے عمل اگر چہ فی نفسہ مفید یا مضر دونوں ہو سکتا ہے لیکن عمل کرنے والے کو وہ اس کی نیت کے مطابق ہی فائدہ پہنچاتا ہے۔ آدمی کے حسن نیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل رب کی رضا کے لیے ہو۔ دکھاوے اور شہرت کے لیے نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کا مقصد لوگوں سے کوئی نفع کمانا ہو۔ یہ حسن نیت کا مختصر اور عام مفہوم ہے۔ اسی کو اخلاص اور اسلام کا نام دیا گیا ہے۔ ایک مخلص موحد اپنے رب کی رضا کا طالب اور اس کے غضب سے ترساں رہتا ہے۔ وہ تقویٰ کی روش اختیار کرتا اور خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتا اور اس کے رسول کی اتباع کرتا ہے۔ چوں کہ اللہ کی محبت آیت والذین آمنوا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (البقرۃ:۶۵) "جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔" کی رو سے ایمان کا مغز ہے اس لیے رسول کی اتباع کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۱)

''کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔''

جب بندہ محبت الٰہی میں کمال حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو الہام کے ذریعے ہدایت فرماتا ہے یا کسی کو مقرر کر دیتا ہے کہ اس کے عمل کی درستی کی اس کو ہدایت دے، جیسا کہ فرمایا:

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔''

مخلص و موحد لوگوں کا حال یہی ہے اور اس راہ کو اختیار کر کے اللہ کے بے شمار بندوں نے اپنا تزکیہ کیا ہے۔

باقی رہے اہل علم تو اپنے ہر عمل سے وہ، وہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اللہ نے اس میں رکھ دیا ہے اور کتاب و سنت میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ جن لوگوں کو معرفت حاصل ہے وہ جب ایک عمل میں یہ نفع نہیں دیکھتے تو جان جاتے ہیں کہ عمل صحیح نہیں ہوا۔ پھر وہ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس عمل کے آداب و شرائط میں سے کون سی چیز پوری نہیں ہوئی۔ وہ کوتاہی کو دور کر کے اپنے عمل کو درست کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے بندوں میں سے حکیم لوگ ہیں۔ ان لوگوں کو یہ درجہ کتاب اللہ میں غور و فکر، خدا خوفی کے احساس اور بھلے اور پائدار کاموں کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ کام رب کی خوشنودی اور اس کی عبودیت میں اخلاص کے کام ہیں۔ یہی راہ حسنِ نیت کی راہ ہے۔ اس حد تک یہ حکماء ان مخلصین کے عمل میں شریک ہیں جنہوں نے اپنی اطاعت اللہ کے لیے خالص کر دی۔

Daira Hamidia

Madrasatul Islah, Saraimeer
Azamgarh, U.P.
Ph: 05462-256022